ماہنامہ

ندائے اعتدال
علی گڑھ

فروری ۲۰۲۰ء | جلد ۱۱ | شمارہ ۸ | جمادی الثانی ۱۴۴۱ھ

بانی: ڈاکٹر محمد غیاث صدیقی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

زیر سرپرستی
حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ العالی
(صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ)

زیر نگرانی
ڈاکٹر سعد ماحی
(سکریٹری علامہ ابوالحسن علی ندوی ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر فاؤنڈیشن)

مدیر
ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی
tariqnadwialig@yahoo.co.in, Mob.9897776652

معاون مدیر
محمد فرید حبیب ندوی

مجلس ادارت
پروفیسر مسعود خالد علیگ ❁ مجیب الرحمٰن عتیق ندوی ❁ محمد قمر الزماں ندوی

مجلس مشاورت
❁ مولانا سید سلمان الحسینی ندوی ❁ مولانا بلال عبدالحی حسنی ندوی
❁ مولانا محمد الیاس ندوی بھٹکلی ❁ ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی
❁ محمد قمر عالم لکھنوی ❁ ڈاکٹر جمشید احمد ندوی
❁ مولانا محمد اخلاق ندوی

شرح خریداری

فی شمارہ:	25:00 روپے
سالانہ:	250:00 روپے
سالانہ اعزازی ممبرشپ:	500:00 روپے
بیرونی ممالک:	30$ ڈالر
لائف ممبرشپ (۲۰ سال):	4000:00 روپے

سرکولیشن انچارج
سعید احمد انصاری 9045616218
محمد آصف اقبال ندوی 9454210673

Bank Acount Detail: Mr Saeed Ahmad Ansari
Acount No: 6561000100039197
IFSC code: PUNB0656100
Punjab National Bank, Medical Road, Aligarh-202002
Mob. 9808850029

خط و کتابت کا پتہ:
مدرسۃ العلوم الاسلامیہ، ہمدرد نگر 'ڈی' کوارسی بائی پاس، علی گڑھ
e-mail: nidaeaetidal@gmail.com

Designed and composed by Abdullah Maroofi, Mob. 8218439622; email-almarufi.abdullah369@gmail.com

Editor: Dr. M. Tariq Ayubi Nadwi

سعید احمد ندوی نے آئیڈیل گرافکس انٹرپرائزیز، علی گڑھ سے چھپوا کر دفتر علامہ ابوالحسن علی ندوی ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر فاؤنڈیشن، ہمدرد نگر ڈی، علی گڑھ سے شائع کیا

Printed & Published by Saeed Ahmad Nadwi behalf of the office of Allama Abul Hasan Ali Nadwi Educational & Welfare Foundation Hamdard Nagar-D, Jamalpur, Aligarh at Ideal Graphics Enterprises, Patwari Nagla, Aligarh

visit us: www.nadwifoundationaligarh.org

فہرست مضامین

۱-	قرآن کا پیغام	دلوں کا سب سے بڑا کھوٹ	علامہ ابن تیمیہؒ
۲-	اداریہ	بھارت کی تاریخ کا نازک موڑ	مدیر ۳
۳-	ملکی صورتِ حال	کرنے کے کام	مولانا امین عثمانی ۹
۴-	//	ہر فرعون کا زوال یقینی ہے	ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی ۱۱
۵-	//	شہریت ترمیمی قانون اور مستقبل کے مسائل	ڈاکٹر محمد منظور منظور عالم ۱۳
۶-	//	منوسمرتی کی تجدید ہے یہ کالا قانون	زین العابدین ۱۶
۷-	//	جب آئین ساز اسمبلی	ابھے کمار، دہلی ۱۸
۸-	//	اندلس میں قانون شہریت کا نفاذ	پروفیسر نگار سجاد ظہیر ۲۲
۹-	//	این آر سی کو واپس لینا کیوں ضروری ہے؟	ترجمہ/ نایاب حسین ۲۴
۱۰-	//	''ہم بھی دیکھیں گے.....''	ابوفہد، دہلی ۲۶
۱۱-	//	بھارتی سماج کے مظلوم و.....وقت کی اہم ضرور	احمد نور عینی ۲۹
۱۲-	//	آج کیوں سینے.....ہمارے شرر آباد نہیں	عبدالرشید طلحہ ۳۱
۱۳-	//	متنازعہ شہریت قانون واپس—احتجاج برقرار	معین دین خالد ۳۳
۱۴-	//	تعلیمی اداروں پر نشانہ کیوں؟	زین العابدین ندوی ۳۸
۱۵-	شخصیات	ریاض الرحمٰن خاں شروانی، کچھ یادیں.....	ڈاکٹر فخر عالم ۴۰
۱۶-	تعلیم و تربیت	تربیت اولاد- چند اہم گوشے	ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ۴۳
۱۷-	تاریخ کے جھروکوں	مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری	ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ۵۳
۱۸-	تعارف و تبصرہ	''بچوں کی تربیت کے رہنما اصول''	محمد اصطفاء الحسن کاندھلوی ۶۱
۱۹-	گوشۂ ادب	شاہین باغ کی معزز خواتین کے نام	ڈاکٹر احمد مجتبیٰ صدیقی ۶۴
۲۰	//	سرفروشانِ علی گڑھ تیرے جذبوں کو سلام	//

❁❁❁

نوٹ: مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔ عدالتی چارہ جوئی علی گڑھ کی ہی عدالت میں ہوسکتی ہے۔

اداریہ

بھارت کی تاریخ کا نازک موڑ

مؤرخین جب اس عہد کی تاریخ لکھیں گے تو ضرور لکھیں گے کہ یہ وقت بھارت کی تاریخ بالخصوص بھارتی مسلمانوں کی تاریخ کا نازک ترین موڑ تھا، تقریبا ایک مہینہ گذر گیا ہے اسی کشمکش اور کسمپرسی میں، حالات انتہائی غیر متوقع ہیں، کبھی کبھی احساس ہوتا ہے کہ کہیں ایک بار پھر ملک میں ایمرجنسی نہ نافذ کردی جائے، اور کی جاسکتی ہے کیونکہ اس کی تیاری مکمل کی جا چکی ہے، فوجی سربراہ کی طرف سے سیاسی بیان دینا بھارت کی ستر سالہ جمہوری روایت کے خلاف ہے، مگر اس بیان کے پیچھے بڑا راز ہے، بھارتی فوج میں برّی، بحری اور ہوائی افواج کے الگ الگ سربراہ ہوا کرتے تھے، تینوں آپس میں صدر جمہوریہ کی اجازت کے بغیر بات تک نہ کر سکتے تھے، مگر موجودہ حکومت نے آئینی و جمہوری اصولوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے جنرل بپن راوت کو مسلح افواج کا سربراہ اعلیٰ (CDS) چیف آف ڈیفنس اسٹاف بنا دیا، سی ڈی ایس صاحب اب صدر جمہوریہ کو جوابدہ نہ ہوں گے بلکہ وہ وزیر اعظم کو جواب دہ ہوں گے، جس سے فوج کی سیاست میں مداخلت کا واضح اشارہ ملتا ہے، اور یہ سمجھا جاسکتا ہے کہ فوج کو اب اپنی مرضی کے مطابق استعمال کیا جاسکتا ہے، بی جے پی حکومت کا یہ اقدام انتہائی خطرناک منصوبہ بندی کی طرف اشارہ کرتا ہے، یہ بات صاف ہے کہ اس طویل عرصہ میں آر ایس ایس تیاری کے تمام مراحل طے کر چکی ہے، اس کے تربیت یافتہ افراد بھارت میں طبقاتی نظام کے قیام اور اعلیٰ ذات (Upercast) کے تحفظ کے لیے اہم عہدوں پر قابض ہو چکے ہیں، اس وقت اس ملک کا آئین، جمہوریت، پسماندہ اقوام اور بالخصوص مسلمان ایک بڑے خطرے سے دوچار ہیں، وہ اس وقت تاریخ کے نازک موڑ پر ہیں اور خطرناک حالات سے گذر رہے ہیں۔

حوصلہ بخش اور خوش آئند بات یہ ہے کہ وقت رہتے عوام نے خطرے کو بھانپ لیا، تحریک آزادی کے بعد یہ پہلا موقع ہے جب ایسی زوردار عوامی تحریک دیکھنے میں آئی کہ بچے بچے کی زبان پر آزادی کے نعرے مچلنے لگے، خود بخود عوام کا ایسا سیلاب سڑکوں پر آ گیا، بلا تفریق مذہب عوامی اتحاد، حب الوطنی کا جذبہ، آئین ہند کے تحفظ کی بے مثال کوشش اور فسطائیت سے نفرت ایک تحریک بن گئی، یہ بھی ایک خاص بات ہے کہ یونیورسٹیز سے لے کر سڑکوں تک عام احتجاجات میں ابھر کر جو شخصیات اور جو طاقت سامنے آئی وہ عورتوں کی ہے، گویا آزادی کی اس تحریک کی مؤثر قیادت عورتوں نے کی، ان کی پامردی، ان کا جذبہ، ان کی گفتگو، ان کے جوابات، ان کا عزم و حوصلہ سب کے سب حوصلہ بخش رہے، آج ایک ماہ سے زیادہ مدت گذر گئی، مظاہروں میں مزید شدت آتی جارہی ہے، شہر شہر غیر متعینہ مدت کے مظاہروں کی تعداد میں اضافہ ہی ہوتا جارہا ہے، حکومت پوری بے شرمی سے

اپنے موقف پر جمی ہوئی ہے، بظاہر ایک انچ پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں، بلکہ وزیر داخلہ نے کہا ہی تھا کہ ہم سی اے اے پر ایک انچ پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں، راقم نے اپنے ٹوئیٹ میں جواب دیتے ہوئے کہا تھا کہ اگر تمہارا یہ عزم ہے تو ہم بھارت کے لوگ عزم کرتے ہیں کہ بھارت کی ایک انچ زمین پر بھی اس قانون کو نافذ نہیں ہونے دیں گے۔

واقعہ یہ ہے کہ حکومتِ وقت تاناشاہی کے راستے پر چل پڑی تھی اور کسی نے اس کا نوٹس نہ لیا تھا، بالخصوص مسلمان تو بالکل ہی غفلت کی نیند میں تھے بلکہ ڈرے سہمے ہوئے تھے، ان سے ان کی قیادت نے سپاوکانگریس کی ایسی غلامی کرائی تھی کہ کبھی انھوں نے خواب میں بھی نہ سوچا تھا کہ ایسے نازک حالات بھی آئیں گے، حکومت اپنے انتخابی منشور کے لحاظ سے ایک ایک کام کرتی گئی، اپوزیشن کو ختم کرتی گئی، ہندتوا کی آگ لگاتی گئی اور راشٹرواد کے نام پر غلط اور جارحانہ پالیسیاں نافذ کرتی گئی حتی کہ بات یہاں تک آ پہنچی کہ آئین کے بنیادی ڈھانچہ کو ہی خطرہ لاحق ہوگیا، منووادا اور ہندوراشٹر کی راہ ہموار کرنے والے اس خطرہ کو لوگوں نے بھانپ لیا اور متحدہ طور پر پرزور آواز بلند کی، اس تحریک کو چھیڑے کا سہرا جامعہ ملیہ اسلامیہ کے طلبہ وطالبات کے سر بندھا، اس کو قوت فراہم کیا علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور پھر جے این یو کے طلبہ وطالبات نے، پھر جب جامعہ و اے ایم یو میں پولیس نے اپنی بربریت سے تحریک کچلنے کی کوشش کی تو ملک و بیرون ملک کی یونیورسٹیوں کے طلبہ سڑک پر آئے، دیوبند، ندوۃ العلماء کے باغیرت و باشعور طلبہ بھی ضبط غم نہ کر سکے، پھر اداروں میں چھٹیوں کے ذریعہ تحریک کے ختم ہونے کا امکان بڑھا تو بعض منظّم تنظیموں نے اپنے کیڈر سے کمک پہنچائی اور پھر ملک بھر کی خواتین اور بالخصوص دہلی کی خواتین نے اس مزاحمتی تحریک کو دوام وتسلسل بخشا، انھوں نے مزاحمت کا جذبہ عطا کیا، وہ اس تحریک کی روح رواں بن گئیں، اب یہ تحریک ملک گیر سطح پر پھیلتی ہی جارہی ہے، اور اس میں خواتین کا رول بڑھتا ہی جارہا ہے، بلکہ خواتین کے اس انقلابی اقدام اور سرفروشانہ کردار سے ہمیں یہ یقین ہوگیا کہ ہماری آئندہ نسلیں آزاد پیدا ہوں گی، وہ خواہ غازی ومجاہد نہ ہوں مگر ہماری طرح بزدل ومصلحت پسند اور غلامانہ ذہنیت کی حامل نہ ہوں گی، بنت حوا کو کس طرح داد دی جائے اور کیسے خراج تحسین پیش کیا جائے جس نے اپنے تن نازک کو مہینے بھر سے سرد راتوں میں سڑک پر ڈال رکھا ہے، ہمیں یقین ہے کہ ان شاہین صفت ماؤں کی کوکھ سے جو نسل جنم لے گی وہ شاہین صفت بن کر دادِ شجاعت دے گی۔

یاد ہوگا کہ راقم نے پہلے ہی لکھا تھا کہ این آر سی پر واویلا مچانے کی ضرورت نہیں، اگر حکومت اپنے ناپاک منصوبے کے نفاذ کے لیے بضد ہوگی تو پھر ہم پوری قوت سے اسے مسترد کریں گے اور ہر پیمانے پر احتجاج کریں گے، یہی کچھ اس وقت ہو رہا ہے، ہر شخص اور ہر بھارتی اپنی بساط بھر اس تحریک میں شریک ہے، کوئی جسمانی قربانی دے رہا ہے کوئی مالی، کوئی زبان وقلم اور ذرائع ابلاغ کے ذریعہ خدمت کر رہا ہے تو کوئی فکری کمک پہنچا رہا ہے، صرف مفاد پرست، فریب دینے والے، مصلحت پسند، بزدل اور زنجیر وزنداں سے خائف لوگ خاموش ہیں، بلکہ بعض مصلحت کے مارے اور پرسکون زندگی کے عادی سوال کرتے ہیں کہ ان مظاہروں کا کیا فائدہ؟ ان بے چاروں کو اب تک یہ بات سمجھ میں نہ آسکی جو ہم نے کئی ماہ قبل بھی لکھی تھی کہ جمہوریت میں سڑک کی لڑائی Street Fight ہی انائیت وانارکی اور تاناشاہی کا واحد علاج اور حل ہے، یہ حقیقت ہے کہ جمہوریت میں عوامی رجحان Public intrest ہی پالیسیوں کی اصل بنیاد ہوتا ہے، مگر جب نیت خراب ہو تو عوامی رجحان سے قطع نظر حکومتیں بند کمروں میں

فیصلے کر لیتی ہیں اور اکثریت کے نشہ میں چور ہوکر طاقت کے بل پر وہ فیصلے نافذ کرتی ہیں، پھر اسٹریٹ فائٹ ہی ان استبدادی قوانین اور جابرانہ پالیسیوں کو تبدیل کرنے کا ذریعہ بنتی ہے، عمل سے فارغ بزدل لوگ ان مظاہروں کے فوائد کو کیا سمجھیں کہ یہ مزاحمتی مظاہرے فرعونیت کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں، انھوں نے ۵/سال میں مکمل ہونے والے منصوبوں کو ۲۰/سال پیچھے ڈھکیل دیا، انھوں نے آئین کے تحفظ کے لیے اسٹریٹجی بنانے کی مہلت فراہم کی، انھوں نے عوام کو سوچنے اور سوال کرنے کا حوصلہ دیا، انھوں نے دلوں میں بیٹھ گئے خوف سے نجات دلائی، انھوں نے اکثریت رکھنے والی حکومت کو پارلیمنٹ کے ذریعہ پاس کیے گیے ایک ''غلط'' قانون کے لیے عوامی حمایت طلب کرنے پر مجبور کیا، حکومت نے حمایت میں عوامی ریلیوں کا مطالبہ کیا، مس کال کی مہم چلائی اور ملک کی تاریخ میں وہ موقع بھی آیا کہ کورٹ نے کچھ یوں تبصرہ کیا کہ بھارت کی تاریخ میں یہ پہلا موقع ہے جب کسی قانون کو آئینی قرار دینے کے لیے عرضی داخل کی گئی، کورٹ نے اس پر حیرت کا اظہار کرتے ہوئے عرضی خارج کر دی، ان مظاہروں کی طاقت ہے کہ ۱۱/اسٹیٹ مخالفت پر آمادہ ہیں، کسی نے سی اے اے کی حمایت کی مگر NRC کے خلاف ہے، کوئی دونوں کے خلاف ہے، کیرلا اور پنجاب حکومت نے اپنی اسمبلی سے اس کی غیر آئینی حیثیت کو بتانے کے لیے ریزولوشن تک پاس کر دیا اور کیرلا حکومت تو سپریم کورٹ بھی پہنچ گئی، کیرلا اور بنگال حکومت نے NPR کے حکم نامہ پر اب تک عمل نہیں کیا ہے، یہ سب کچھ آئین ہند کے دائرے میں ہوا اور ہو رہا ہے، اور جو کچھ بھی ہو رہا ہے وہ ان مظاہروں کے نتیجہ میں ہو رہا ہے۔ ابھی کل ہی وزیر داخلہ کا بیان آیا ہے کہ NPR کے اضافی سوالات میں سے تین سوال کم کر دیے گئے ہیں، (کون سے کم کیے گئے یہ ابھی مبہم ہے) کوئی کاغذ نہیں مانگا جائے گا اور نہ ہی بائیومیٹرک ڈاٹا لیا جائے گا، اس بیان سے پتہ چلتا ہے کہ ابھی کچھ اور محنت اور قربانی کی ضرورت ہے، یہ ان مظاہروں کی طاقت ہے جو وزیر داخلہ کو جگہ جگہ ریلیاں کرنے پر مجبور کیے ہوئے ہے، یہ مظاہرے ہی ہیں جن کے سبب بھاگوت نے اپنے بیان میں کہا کہ بھارت میں صرف آئین کی حکمرانی ہے، ہم اسی آئین کو مانتے ہیں جو اس وقت لکھا گیا جب ہمارا وجود نہ تھا، اگر کوئی ایسا کام ہوا جو اس آئین کے خلاف ہو تو ہم اس کی مخالفت کریں گے، سوچیے ذرا جنھوں نے ۷۲/سال میں کبھی ترنگا نہ لہرایا اور ہمیشہ آئین کی مخالفت کرتے رہے وہ آج آئین کی حکمرانی کا اعتراف کر رہے ہیں، اس پر کس نے مجبور کیا؟ ان مظاہروں نے مسلم قوم کو ایک نئی زندگی دی ہے، انھیں خود ان کی قیادت نے اپنے مفادات میں استعمال کر کے ناکارہ بنا دیا تھا، انھیں ان کی حیثیت سے بھی غافل کر دیا تھا، مگر وقت نے انگڑائی لی تو آج یہی قوم آزادی کے بعد کی سب سے اہم، سب سے طویل اور سب سے خطرناک جنگ کی قیادت کر رہی ہے، ان مظاہروں نے بہت واضح پیغام دیا ہے کہ مسلمانوں کو نہ ڈرایا جا سکتا ہے اور نہ ان کو دبانا ممکن ہے، وہ اپنے پورے تشخص (Identity) کے ساتھ یہیں رہیں گے، یہیں مریں گے اور اسی مٹی میں دفن ہوں گے۔

بعض عقل کے مارے سوال کرتے ہیں کہ اگر حکومت پیچھے نہ ہٹی تو کیا ہوگا؟ ان کو سمجھنا چاہیے کہ کوئی جنگ اگر مگر یعنی (If & But) کی پالیسی کے ساتھ نہیں لڑی جاتی بلکہ یہ سوچ کر لڑی جاتی ہے کہ فتح ہماری ہی ہوگی، پھر اسی کے لیے ساری تگ و دو ہوتی ہے اور سارے منصوبے بنائے جاتے ہیں، یوں بھی قرآن مجید کے مطالعہ سے صاف پتہ چلتا ہے کہ ہر ظلم کی ایک انتہا ہے، ہر فرعون کے لیے زوال مقدر ہے، ہر استبداد کو بالآخر شکست ہونی ہے، شرط یہ ہے کہ خدا کے سامنے جوابدہی کا احساس ہو، تسلسل کے ساتھ مزاحمت کی جائے اور ظالم کے ظلم کی نشاندہی کرتے ہوئے اپنا فرض منصبی ادا کیا جائے، لیکن جب قبلہ درست نہ ہو، ترجیحات

کا صحیح تعین نہ ہو، غلامانہ فکر نے پنجے گاڑ دیے ہوں، منفیت (Nigativity) دامن گیر ہوگئی ہو، محدودیت مقدر بن گئی ہو، قرآن محض سامان برکت بن کر رہ گیا ہو تو پھر ایسے ہی مایوسی ہوتی ہے اور اسی طرح کے سوالات ذہن میں آتے ہیں۔

یہ بات اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ ابھی لب کھولنے کی آزادی ہے، آوازیں دبانے کی مہم کے دوران اچانک نوجوانوں نے آواز بلند کرنے کی طاقت ور تحریک چھیڑ دی ہے، اس وقت اگر یہ تحریک بے نتیجہ ختم ہوگئی، ہماری مصلحت کوشیوں کا شکار ہوگئی، ہماری ذہنی پستیوں، محدود ذہنیت یا قیادت کی ہوس کا شکار ہوگئی، تو فسطائیت کا سینہ مزید چوڑا ہو جائے گا، وہ کھلے عام دندنائے گی، ظلم کا ننگا ناچ ناچے گی، اس کے منصوبے کی تکمیل بہت آسان ہوگی، ابھی سیکولر آئین کا لعدم نہیں ہوا ہے، ابھی سیکولرزم کے سہارے آپ آئینی مزاحمت کے ذریعہ اپنی بات منوا سکتے ہیں، ابھی موقع ہے کہ تمام طرح کے مفادات واختلافات سے بالا ہو کر صرف آئین کی اس لڑائی کو کسی مثبت نتیجہ تک پہنچانے کی کوشش کی جائے، اس سلسلہ میں جن لوگوں نے بھی جس سطح پر بھی کوششیں کیں وہ سب لائق مبارکباد اور ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں، طلبہ ہوں یا اساتذہ عوام ہوں یا خواص سب کو مل کر ایک دوسرے کا تعاون کرتے ہوئے اس تحریک کو مضبوط کرنا وقت کی سب سے بڑی ضرورت اور ہمارا ملی وقومی فریضہ ہے، اگر خود مظاہرہ کی ہمت نہیں یا بوجوہ مصلحت کے خلاف سمجھتے ہیں تو کم از کم مظاہرین کی ہر ممکن مدد کیجئے اور کم از کم انھیں اس نظر سے مت دیکھیے جس نظر سے مجرموں کو دیکھا جاتا ہے، بلکہ ان کی جرأت وعظمت کو سلام کیجئے کیونکہ انھوں نے مجاہدین آزادی کے نقش قدم پر ایک قدم بڑھایا اور بالفاظ دیگر آزادی کی اس دوسری لڑائی میں اپنا حصہ ڈالا۔

ابتدا میں ہی یہ احساس ہوا تھا کہ تمام کوششوں کو منظم ومتحد کرنا بہت ضروری ہے تاکہ یہ کوششیں مؤثر ہوسکیں، مختلف جگہوں پر لکھا اور مختلف لوگوں سے اظہار کیا، بالآخر ۱۸؍دسمبر کو ملک بھر کی درجنوں تنظیموں نے مل کر ایک دفاق بنالیا، جس کا مقصد صرف یہ تھا کہ ایک متحدہ پالیسی طے کی جائے اور تمام تنظیمیں اپنے اپنے طور پر اس کا نفاذ کریں، یہ وفاق اس لڑائی میں بھارتی قوم کی نمائندگی کرے، لیکن صد افسوس کہ مہینہ بھی نہ گزرنے پایا تھا کہ لوگ ہر گلی کوچہ میں الگ الگ محاذ ووفاق بنانے لگے، خود ستائی اور اپنی سربراہی کی لَت نے اس امت کے ہر اتحاد کو ہمیشہ پارہ پارہ کیا ہے، ایسے نازک حالات میں بھی عدم برداشت اور قیادت کی ہوس اور کریڈٹ خوری کی لڑائی کا مشاہدہ انتہائی تکلیف دہ ہے، بلکہ یہ صورت حال بذات خود ہماری لڑائی کو کمزور کرنے میں مددگار اور دشمن کے لیے معاون ہے، اگر سب کا مقصد ایک ہے تو ایک ہی وفاق کی پالیسیوں کا حصہ بننے میں کیا دشواری ہے؟ مگر نہیں ہم وہ مریض ہیں کہ مرض کسی حال میں پیچھا نہیں چھوڑتا، ابھی تو ضرورت تھی کہ اتحاد کو مزید قوت دی جاتی، یاد رکھیے کہ ہندوؤں کی شرکت کے بلند بانگ دعوے خلاف واقعہ ہیں، سکھ لڑنے مرنے کو تیار ہیں، یہ دعویٰ حقیقت سے پرے اور مبالغہ آرائی کی مضحکہ خیز مثال ہے، حقیقت اور زمینی حقیقت یہ ہے کہ سکھوں کی ایک تعداد بھی اس تحریک کا علامتی حصہ ہیں، دلتوں کا وہ انٹیلیکچول طبقہ ساتھ ہے جس پر یہ واضح ہے کہ آگے کیا ہونا ہے، عام اور نچلا دلت طبقہ تو ابھی مودی کے ہندتوا کے نشہ میں چور ہے، وہ سمجھ رہا ہے کہ اب اس قانون کے ذریعہ مسلمان اپنی جائیدادوں سے بے دخل کیے جائیں گے اور وہ سب ہمیں مل جائے گی، خود اس کو یہ سمجھانا اس وقت اہم کام ہے کہ اس قانون کی زد ان پر کتنی اور کس طرح پڑنے والی ہے، دراصل کمیونسٹوں کے نام عام طور پر ہندوؤں والے ہیں، اس لیے لگتا ہے کہ ہندو بڑی تعداد میں ہمارے ساتھ ہیں، جبکہ لیفٹ کا بھی ایک طبقہ باوجود

مزاحمت کار ہونے کے ہمارے ساتھ متحد ہونے کو تیار نہیں کیونکہ وہ کسی Identity یعنی کسی تشخص کے ساتھ بیٹھنا پسند نہیں کرتا، اس لیے بغیر کسی خوش فہمی اور مبالغہ آرائی کے زمینی سطح پر مخلصانہ کوششیں کرنے کی ضرورت ہے تاکہ انقلاب کی یہ آہٹ واقعی انقلاب کی صبح روشن میں تبدیل ہو سکے، اس سلسلہ میں سب سے اہم اقدام یہ ہے کہ نچلے اور پچھڑے غیر مسلم طبقات کو اس حکومتی ظلم کے مضمرات سے آگاہ کیا جائے اور ان کے جو جوگ ہمارے ساتھ اسپیچ شیئر کرتے ہیں انھیں اس پر آمادہ کیا جائے کہ اپنی آبادی کے تناسب سے اس مزاحمتی تحریک میں اپنے لوگوں کو شریک کریں۔

نوجوان اور خواتین میدان میں ہیں، آپ کو یاد ہوگا کہ راقم نے دوبارہ بی جے پی سرکار بننے کے فوراً بعد لکھا تھا کہ اب بولنا بہت مشکل ہے مگر بہت ضروری بھی ہے، لیکن اب وہی لوگ بول سکیں گے جو باہمت ہوں گے، صاحب عزیمت ہوں گے، یا بے داغ ہوں گے، باقی بہت سارے لوگ اب سرکاری زبان بولیں گے یا خاموش رہیں گے، خاموش رہنے والوں میں کچھ وہ ہوں گے جو مجبوراً خاموش رہیں گے یا انھیں خاموش کر دیا جائے گا اور کچھ وہ ہوں گے جو اختیاری طور پر مصلحتاً منظر نامہ سے غائب رہیں گے، بہر حال اب جو بول رہے ہیں ان ہی کو مستقبل کا قائد سمجھ لینا بھی دانشمندی نہیں، ان میں سب کے سب قابل اعتبار بھی نہیں، قریب سے دیکھنے والے جانتے ہیں کہ حقیقی صورتِ حال کیا ہے، لیکن یہ بھی ضروری ہے بلکہ مستقبل کے لیے اس کی اشد ضرورت ہے کہ اس مزاحمتی تحریک سے منتخب افراد کی ایک جماعت تشکیل پائے جو مستقبل میں قومی وملی سطح پر مؤثر قیادت کر سکے اور خود اس مزاحمتی تحریک کو انجام تک پہنچا سکے، کیونکہ اب سالہا سال تک حالات اسی طرح غیر متوقع رہنے کی امید ہے، یہ لڑائی اب کھل کر ہونے والی ہے اور طویل مدت تک چلنے والی ہے، دہلی و بنگال کے انتخابی نتائج مزید رخ طے کر دیں گے، بی جے پی کی فتح وشکست بہر دو صورت صورتِ حال کے بگڑنے کے مزید امکانات ہیں، اس لیے ضرورت ہے کہ پھولوں کی سیج پر بیٹھ کر قیادت کے طلب گار لوگوں سے بچتے ہوئے کانٹوں سے الجھنے کی ہمت رکھنے والے سامنے آئیں اور پورے ملک کا دورہ کر کے ایک نئے انقلاب کی بنیاد رکھیں، عوامی بیداری کی یہ لہر اگر یوں ہی گذر گئی تو پھر کئی دہائیوں تک اس کی تلافی ممکن نہ ہوگی۔

فوری طور پر ضرورت ہے کہ مختلف شہروں میں جو مظاہرے جاری ہیں ان کو اپنے اپنے مقام پر ہلکی پھلکی کوششوں سے ہی کمک پہنچائی جائے، سیاسی شعور پیدا کرنے کی محنت کی جائے، لوگوں کو NPR کے بائیکاٹ پر آمادہ کیا جائے، انھیں بتایا جائے کہ وزیر داخلہ صاف کہہ چکے ہیں کہ NPR خود ہی NRC کی طرف پہلا قدم ہے۔ اس میں اضافی سوالات دراصل NRC کی بنیاد ہیں، اس کا واحد حل بائیکاٹ ہے، جمہوری لڑائی میں آخری ہتھیار رسول نافرمانی (Civil Disobedience) ہے، مختلف اقوام و مذاہب پر مشتمل محاذ نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ NPR کا بائیکاٹ کیا جائے، اس کے لیے ضروری ہے کہ ہر شخص جگہ جگہ اپنی بساط بھر گھر گھر جا کر لوگوں کو خطرات سے آگاہ کرے، ہر گلی نکڑ پر میٹنگیں اور پروگرام کرے، آئین کے تحفظ کے لیے غیر مسلموں کو آمادہ کرے، حکمت کا کامیاب تجربہ کرے، احتجاج کے نئے نئے طریقوں کا تجربہ کرے، مثلاً ہر شخص اپنے محلّہ میں مشورہ کرے کی ہم کو بائیکاٹ کرنا ہے اس کے اعلان کرنے کے لیے پورے محلے میں بائیکاٹ کے بینر لگا دیے جائیں، کسی دن سارے لوگ ایسا کُرتا/شرٹ/ٹوپی پہنیں جس پر No NPR لکھا ہو، اس طرح خاموش احتجاج کے بہت سے طریقے اپنائے جا سکتے ہیں، جن کے ذریعہ مزاحمتی تحریک کو کامیاب اور مؤثر بنایا جا سکتا ہے، یاد رکھیے کہ مرکزی حکومت گزٹ نوٹیفکیشن کر چکی ہے، ہمارے پاس صرف یکم

اپریل سے پہلے تک کا وقت ہے، ہمیں اس سے پہلے گاؤں گاؤں اور گھر گھر اس تحریک کو پہنچانا ہے کہ NPR کا بائیکاٹ کیا جائے، کیونکہ اس کی بنیاد پر ادنیٰ درجہ کے آفیسر کو بھی یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ جس کو چاہے مشکوک شہری Doubtfull Citizen قرار دے دے، ایک بار وہ مشکوک شہری قرار دے دے گا پھر آپ ثابت کرتے پھریں گے اپنی شہریت، اس کے لیے سب سے اہم بات یہ ہے کہ آپ کو اپنے والدین کا Birth Certificate دینا ہوگا جو شاید ہی کچھ لوگ دے سکیں، بہر حال مشکلات بہت ہیں، مستقبل میں مسائل مزید پیدا ہونے کے امکانات ہیں، حل صرف ایک ہے کہ مخلصانہ طور پر مزاحمت کی جائے، اللہ پر بھروسہ رکھا جائے، رجوع الی اللہ کو ہتھیار بنایا جائے، متحدہ کوششوں پر لبیک کہا جائے، اور یہ طے کرلیا جائے کہ ہمیں اپنی شہریت ثابت کرنے کے لیے کوئی کاغذ نہیں دکھانا ہے، (یہ الگ بات ہے کہ نارمل حالات میں بھی تمام ضروری کاغذات اپنے پاس رکھنا ہی دانشمندی ہے) بلکہ جو کاغذ دیکھنے آئے اس سے پوچھنا ہے کہ تم بھارتی ہو یا گھس پیٹھیا؟ یقیناً وہ جواب دے گا کہ وہ بھارتی ہے، پھر اس سے بھارتی ہونے کا ثبوت مانگا جائے، جو وہ بالیقین نہیں دے سکے گا کیونکہ حکومت کے مطابق پاسپورٹ، آدھار کارڈ، راشن کارڈ، پین کارڈ اور جاب آئی ڈی اور ڈرائیونگ لائسنس وغیرہ شہریت کا ثبوت نہیں ہے، اس لیے اسے اپنا اور اپنے والدین کا برتھ سرٹیفکیٹ دکھانا ہوگا، جب وہ نہ دکھا پائے تو اس سے کہیے کہ حکومت کی زبان میں آپ گھس پیٹھیے قرار پائے اس لیے آپ کو دوسروں سے کوئی کاغذ مانگنے کا حق نہیں، اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ NPR, NRC, CAA سب ایک ہی زنجیر کی کڑیاں ہیں، جنھیں جوڑ کر دیکھنا ہو تو ہٹلر کی تاریخ پڑھ لیجئے سب واضح ہو جائے گا، اس وقت حکومت سب کچھ اسی ترتیب پر اس طرح کر رہی ہے جس طرح ہٹلر نے کیا تھا، ہم نے الگ الگ ان تینوں چیزوں کی تفصیل نہیں لکھی ہے، کیونکہ سوشل میڈیا کے دور میں یہ تمام تفصیلات تقریباً سب تک پہنچ رہی ہیں، بس چند ضروری چیزوں کی طرف اشارہ کیا ہے، دشمن نے اگر وقت سے پہلے آپ کو بیدار کر دیا ہے تو اس کا شکریہ ادا کیجئے، بیداری سے فائدہ اٹھائیے یہی وقت کی ضرورت ہے بلکہ اس وقت کی اہم عبادت ہے۔

☆☆☆

نوٹ: اگر اس سلسلہ میں کسی طرح کا کوئی سوال ہے تو اس نمبر پر کسی بھی وقت رابطہ کر کے معلوم کیا جا سکتا ہے، مزید اگر قانونی تفصیلات کو سمجھنا ہے تو یوٹیوب پر مشہور ماہر قانون پروفیسر فیضان مصطفیٰ کی سلسلہ وار ویڈیوز سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔

91+ 9897776652

(ڈاکٹر محمد طارق ایوبی)

❑ ملکی صورتِ حال

کرنے کے کام

امین عثمانی

ہمارا وطن، ہمارا ملک فاشسٹ گروپوں کے ہاتھ میں ہے، فاشزم پر یقین رکھنے والے اپنے منصوبوں کو سیاسی، سماجی، تعلیمی، ثقافتی، تہذیبی سطح پر لانے اور لاگو کرنے کے لیے کوشاں ہیں۔ فاشزم کا بہاؤ تیز ہوگیا ہے، دستور ہند کی روح اور منشا کے خلاف قانون لائے جارہے ہیں، اسی کے ساتھ طاقت کا غلط اور ناجائز استعمال ہو رہا ہے، ظالمانہ کارروائیاں تیز ہوگئی ہیں۔

NRC آسام میں لاگو کیا، لیکن وہاں کیا کیا ہوا، شہریوں کو کس کس طرح اذیتوں میں ڈالا گیا، حکومت نے عام انسانوں کو، خاندانوں کو، کمزوروں کو کس طرح سخت پریشانیوں میں ڈالا، خدا کی پناہ کروڑوں روپے، وقت، آدھار کارڈ، پان کارڈ وغیرہ کچھ نہیں چلے گا، ہر ایک کے باپ، دادا کے ہندوستان میں پیدا ہونے کا کاغذی ثبوت چاہیے۔ ظاہر ہے، یہ ممکن نہیں ہے، باپ، دادا کی برتھ سرٹیفکیٹ (پیدائش کا مستند ثبوت) کے بغیر NPR نہیں ہوگا۔

حکومت چلانے والی آر ایس ایس کا اصل ارادہ یہ ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد کو پورے ملک میں ووٹ دینے کے حق سے، شہریت کے حق سے محروم کردیا جائے، یہ بہت تشویشناک اور خطرناک شطرنجی چال اور سوچ ہے۔ یہ تینوں قانون NPR, NRC, CAA کالا قانون ہے، اس سیاہ قانون کے ذریعہ ہندوستانی عوام کو اذیت، بربادی، محرومی سے دوچار کردینا زعفرانی پارٹی کا نشانہ ہے اور دیش بھکتی کے نام پر دستور ہند کے ساتھ کھلواڑ ہے۔

اس لیے آپ کی ذمہ داری ہے کہ آپ اسے سیاسی معاملہ سمجھ کر یا سیاست کہہ کر رخ نہ موڑیں، بلکہ آپ اسے بنیادی انسانی حقوق، مصالح دین اور مقاصد دین میں شمار کریں، آزادی اور عزت کے ساتھ جینا، مقاصد شریعت میں سے ہے۔ اسے تقوی اور دینداری کے خلاف تصور کرنا درست نہیں، کیونکہ ان قوانین کا تعلق مسلمانوں کے معاملات و مسائل اور ان امور میں سے ہے جن پر زندگی کا دارومدار ہے۔ من لم یھتم بامور المسلمین فلیس منھم کا تقاضا ہے کہ آپ اٹھ

کھڑے ہوں۔ کیا مسلمانوں کی مشکلات کا ازالہ کرنا اور ان کی حفاظت کرنا دین کا تقاضا نہیں، کیا یہ مصالح شرع کے خلاف ہے۔

پھر کیوں ہمارا رویہ ایسا ہے کہ ہم مدرسوں کے نوجوان طلباء (جو اسی سماج کا حصہ اور ملک کے شہری ہیں) کو نکال دینے، گھر بھیج دینے، پولیس کے حوالہ کرنے کی بات کرتے ہیں، ہم کیوں احتجاج کرنے والی خواتین کے لیے پولیس بلانے کی بات کرتے ہیں، ہم کیوں مسجدوں کے منبر سے اس مسئلہ پر بولنے سے گھبراتے ہیں، حکومت کی مدد سے چلنے والے مدرسوں کے علماء ان مسائل پر بولنے سے کیوں کتراتے ہیں، ایسا کیوں ہے؟

یہ معاملہ ایسا نہیں کہ اسے "التھلکة" کہہ کر خاموش رہا جائے، تاریخ کے مد وجذر سے آگاہ علماء کا یہ شیوہ نہیں کہ وہ پیٹھ موڑ لیں۔ رہے وہ لوگ (حکومت وقت سے وابستہ علماء) جو درباری ہونے کی وجہ سے اور ظالموں کی تائید کی وجہ لا تـرکـنـوا الـی الـلـذیـن ظـلـمـوا کے مصداق ہیں، لہٰذا ان کی شکلوں کو شمار کرنے کی ضرورت نہیں۔

مگر آپ کیا کریں:

آپ اپنے اپنے علاقہ میں اہل ثروت، مخیّرین کو جمع کر کے مسلمانوں کے حالات ومسائل اور ضرورتوں سے واقف کرائیں، انفاق فی سبیل اللہ پر ابھاریں، ہنگامی حالات کے لیے مالیہ کا نظم کریں، وکلاء کو جمع کر کے ان کے سامنے ملت کی پریشانیوں کو رکھیں، مقدمات لڑنے، گرفتار شدگان کو رہا کرانے کے لیے کارروائی کرنے پر آمادہ کریں، گرفتار شدہ افراد کے گھر اور اہل و عیال کی مدد کریں، ان سے ملیں، احتجاج میں تنوعات، رنگا رنگی پیدا کریں، دیواروں، سڑکوں پر اچھے نعرے لکھوائیں، اپنے ہم وطنوں (سکھ، عیسائی، دلت، ہریجن، ہندو بھائیوں) سے رابطہ کر کے ان قوانین سے ہونے والے نقصانات کے بارے میں بتائیں، خواتین کے دھرنے منظّم کریں، سوشل میڈیا کا زیادہ سے زیادہ استعمال کریں، رات میں مشعل جلوس نکالیں، اپنے حلقہ اثر، تلامذہ، مریدین کو سمجھائیں اور بتائیں کہ یہ انصاف اور حقوق، نیز دستور کے تحفظ کی بات ہے، آپ مساجد میں قنوت نازلہ، آیت کریمہ پڑھوانے اور دعا کا بھی اہتمام کریں، لیکن برادران وطن کو ساتھ لے کر چلیں، ائمہ کے ذریعہ خطبات جمعہ میں ان مسائل پر روشنی ڈالیں، عوام کا حوصلہ بڑھائیں، خود بھی باخبر رہیں اور قوم کو بھی باخبر رکھیں۔

امید کہ آپ توجہ فرمائیں گے۔

☆☆☆

❑ ملکی صورتِ حال

ہر فرعون کا زوال یقینی ہے

(ہندوستان کے موجودہ حالات کے پس منظر میں)

ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی

(۱) فرعون روئے زمین میں بہت سرکشی کرنے والا تھا اور وہ حد سے گزرنے والوں میں سے تھا۔(یونس:83، طہ:24،43،المؤمنون:46،القصص:4)

☆ فرعون روئے زمین میں بہت سرکشی کرنے والا ہے اور وہ حد سے گزرنے والوں میں سے ہے۔

(۲) فرعون اور اس کے درباریوں نے بڑائی کا گھمنڈ کیا اور وہ مجرم لوگ تھے۔(یونس:75،العنکبوت:39، الزخرف:5251،دخان:22)
وہ بڑے بدکردار لوگ تھے۔(النمل:12)

☆ فرعون اور اس کے درباری اپنی بڑائی کا گھمنڈ کرتے ہیں اور وہ مجرم اور بدکردار لوگ ہیں۔

(۳) فرعون اور اس کے درباریوں کو اقتدار پر اپنی گرفت ہونے کا بڑا غرّہ تھا_)الاعراف:(127وہ لوگوں پر بڑا ظلم کرتے تھے۔(الشعراء:10)

☆ فرعون اور اس کے درباریوں کو اقتدار پر اپنی گرفت ہونے کا بڑا غرّہ ہے۔ وہ لوگوں پر بہت ظلم کررہے ہیں۔

(۴) فرعون نے اپنے ملک کے باشندوں کو گروہوں میں تقسیم کر رکھا تھا اور ان میں سے ایک گروہ کو کم زور بنا کر رکھا تھا۔(القصص:4)

☆ فرعون نے اپنے ملک کے باشندوں کو گروہوں میں تقسیم کرنے اور ان میں سے ایک گروہ کو کم زور کرکے رکھنے کی کوشش کی ہے۔

(۵) فرعون اپنے ملک کے شہریوں کی بڑی تعداد کو اذیتیں دیتا تھا)_طہ:(47 اس نے انھیں غلام بنا رکھا تھا۔(الشعراء:22)

☆ فرعون اپنے ملک کے شہریوں کی بڑی تعداد کو اذیتیں دیتا ہے_وہ انھیں غلام بنا کر رکھنا چاہتا ہے۔

(۶) فرعون نے فتنہ و فساد پھیلا رکھا تھا۔ (الاعراف:103،القصص:4(لیکن وہ دوسروں کو فسادی کہتا تھا۔(الاعراف:127،مؤمن:26)

☆ فرعون نے فتنہ وفساد پھیلا رکھا ہے،لیکن وہ دوسروں کو فسادی کہتا ہے_

(۷) فرعون اپنے عوام کے درمیان نعرہ لگاتا تھا:اَنَا رَبُّکُمُ الاعلٰی۔میں ہوں تمھارا سب سے بڑا پالنہار۔(النازعات:24)

☆ فرعون اپنے عوام کے درمیان نعرہ لگاتا ہے: میں ہوں تمھارا سب سے بڑا خیر خواہ اور تمھارے لیے سب

سے زیادہ کام کرنے والا۔

(۸) فرعون اور اس کے درباری اپنے مخالفین پر بے بنیاد الزامات لگاتے تھے۔(الاعراف:109-110)

☆ فرعون اور اس کے درباری اپنے مخالفین پر بے بنیاد الزامات لگاتے ہیں۔

(۹) فرعون اپنے ملک کے لڑکوں کو قتل کرواتا تھا۔ (الاعراف:127،القصص:4)

☆ فرعون اپنے ملک کے لڑکوں کو قتل کرواتا ہے۔

(۱۰) فرعون کی مملکت میں لڑکیوں کی عصمت محفوظ نہیں تھی۔(الاعراف:127،القصص:4)

☆ فرعون کی مملکت میں لڑکیوں کی عصمت محفوظ نہیں ہے۔

(۱۱) فرعون لوگوں کو اپنا ہم خیال بنانے کے لیے لالچ دیتا تھا۔(الاعراف: 113- 114، الشعراء: 41-42)

☆ فرعون لوگوں کو اپنا ہم خیال بنانے کے لیے لالچ دیتا ہے۔

(۱۲) فرعون اپنے مخالفین کو دھمکیاں دیتا تھا۔(الاعراف :123-124، طٰہٰ:71، الشعراء:29،49)

☆ فرعون اپنے مخالفین کو دھمکیاں دیتا ہے۔

(۱۳) فرعون نے آبادی کے بڑے حصے کو ان کے وطن سے نکال باہر کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ (بنی اسرائیل : 103)

☆ فرعون نے آبادی کے بڑے حصے کو ان کے وطن سے نکال باہر کرنے کا ارادہ کیا ہے۔

(۱۴) فرعون کو ارب پتی قارون کی حمایت حاصل تھی۔ (القصص:76، العنکبوت:39، مؤمن:24)

☆ فرعون کو ارب پتی قارونوں کی حمایت حاصل ہے۔

(۱۵) فرعون ہزار تنبیہات کے باوجود اپنی سرکشی سے باز نہیں آیا۔

☆ فرعون ہزار تنبیہات کے باوجود اپنی سرکشی سے باز نہیں آ رہا ہے۔

(۱۶) آخر کار فرعون ہلاک ہو کر رہا۔(الاعراف :136، یونس :90، الفرقان : 36.....، المؤمنون :48، الشعراء:66، القصص:40، الذاریات:40)

☆ آخر کار فرعون ہلاک ہو کر رہے گا۔

(۱۷) فرعون کا لاؤلشکر اس کے کچھ کام نہ آیا۔

☆ فرعون کا لاؤلشکر اس کے کچھ کام نہ آئے گا۔

(۱۸) کم زور بنا کر رکھے جانے والوں کو خوش خبری دی گئی تھی: "اللہ سے مدد مانگو اور صبر کرو_ زمین اللہ کی ہے، وہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے اس کا وارث بنا دیتا ہے، اور آخری کام یابی انہی کے لیے ہے جو اس سے ڈرتے ہوئے کام کریں۔" (الاعراف:128)

☆ آج بھی کم زور بنا کر رکھے جانے والوں کو خوش خبری ہو:

"اللہ سے مدد مانگو اور صبر کرو، زمین اللہ کی ہے، وہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے اس کا وارث بنا دیتا ہے، اور آخری انجام کار انہی کے لیے ہے جو اس سے ڈرتے ہوئے کام کریں۔"

(۱۹) ہر فرعون کا مقدّر ہلاکت ہے۔

بس شرط یہ ہے کہ حتّی الامکان ظلم کے خلاف برابر مزاحمت جاری رکھی جائے _ اللہ سے مدد چاہی جائے اور صبر و استقامت کا مظاہرہ کیا جائے۔

☆☆☆

❑ ملکی صورتِ حال

شہریت ترمیمی قانون اور مستقبل کے مسائل

ڈاکٹر محمد منظور عالم

شہریت ترمیمی بل ہندوستان کے آئین، دستور اور اصول کی صریح خلاف ورزی ہے، انسانی حقوق، انصاف، مساوات، فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور آزادی پر حملہ ہے۔اس بل کا بنیادی مقصد ہندوستان کو ہندو راشٹر بنانا اور سیکولرزم کا خاتمہ ہے۔ بی جے پی نے واضح کردیا ہے کہ وہ اکثریت کی طاقت کی بنیاد پر ہندوستان کو ہندو راشٹر بنائے گی اوراب وہ عملی قدم اٹھارہی ہے۔

شہریت ترمیمی بل اب ایکٹ میں تبدیل ہو چکا ہے، اس کے مطابق حکومت ہند پاکستان، بنگلہ دیش اور افغانستان سے ہجرت کر کے آنے والے مسلمانوں اور یہودیوں کے علاوہ تمام اقوام کو شہریت دے گی۔ پہلے شہریت ملنے کی مدت ۱۱ سال ہوتی تھی اب اسے بھی کم کر کے صرف ۶ رسال کردیا گیا ہے ہندو، سکھ، عیسائی، جین اور بدھسٹ کو شہریت دینے کے لیے یہ ایکٹ بنایا گیا ہے لیکن مسلمانوں کو اس پڑوس میں مذکورہ تین ممالک کے علاوہ میانمار، چین اور تبت جیسے ممالک بھی ہیں۔لوک سبھا میں بل پیش کرتے ہوئے وزیر داخلہ امت شاہ کا کہنا تھا کہ پاکستان، بنگلہ دیش اور افغانستان میں اقلیتوں پر ظلم ہوتا ہے اس لیے انھیں پناہ دینا ہندوستان کا اخلاقی فریضہ ہے، اسی لیے ہم یہ بل لے کر آئے ہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ میانمار اور چین میں بھی مسلمانوں پر ظلم ہورہا ہے، یہ بھی ہندوستان کے پڑوس میں ہیں پھر انھیں شہریت دینے سے ہندوستان انکار کیوں کررہا ہے۔ سری لنکا میں ہندوؤں پر ظلم ہورہا ہے، تبت میں عیسائیوں پر تشدد ہورہا ہے ان کی فکر کیوں نہیں ہے، جبکہ یہ بھی ہندوستان کے پڑوسی ممالک ہیں اور سرحدیں متصل ہیں۔ وزیر داخلہ نے لوک سبھا میں بل پیش کرتے ہوئے یہ بھی کہا کہ بنگلہ دیش اسلامی جمہوریہ ملک ہے، افغانستان اسلامی جمہوریہ ملک ہے، پاکستان بھی اسلامی جمہوریہ ملک ہے پھر ہندو، سکھ عیسائی جین ور بدھسٹ کہاں جائیں گے، اس لیے بھی شہریت ترمیمی بل کا لانا ضروری ہوگیا ہے گویا وزیر داخلہ صاحب نے یہ کہنے کی کوشش کی ہے کہ ہندوستان پر مسلمانوں کا حق نہیں ہے جبکہ موجودہ ہندوستان مسلمانوں کی ہی دین ہے۔ مسلمانوں کی حکومت سے قبل ہندوستان ۵۰۰ سے زیادہ ٹکروں میں بٹا ہوا تھا، مسلمانوں نے متحدہ ہندوستان کی بنیاد رکھی اور مغلیہ حکومت نے اسے عروج بخشا۔ یہ بھی

تاریخ سچائی ہے کہ ہندوستان کے مسلمان بنیادی طور پر ہندوستانی نسل سے ہی تعلق رکھتے ہیں، اسلام مذہب میں انھیں سکون ملا اس لیے انھیں اسے قبول کرلیا، دنیا کے کسی بھی مذہب اور قانون میں مذہب قبول کرنے سے کسی کا وطن تبدیل نہیں ہوتا ہے۔ ہندوستان میں کسی ایک مذہب کے ماننے والے نہیں رہتے ہیں بلکہ یہی مختلف مذاہب کا سنگم ہے، کئی مذہب کی شروعات یہیں سے ہوئی ہے، اس لیے ہندوستان جیسے ملک کا کوئی ایک مذہب نہ پہلے کبھی تھا اور نہ آج ہوسکتا ہے۔ مؤرخین نے مسلم حکمرانوں کی حکومت کو بھی اسلامی حکومت قرار نہیں دیا ہے کیوں کہ انھوں نے سیکولرزم اور جمہوری اقدار کے مطابق حکمرانوی کی۔ سبھی مذاہب کو آزادی، انصاف، مساوات اور تحفظ فراہم کیا، ذرہ برابر بھی مسلمان اور غیر مسلمان کے درمیان کسی طرح کا فرق نہیں کیا حالانکہ برہمن بنیادی طور پر اصل ہندوستانی نہیں ہیں، ڈی این اے ٹیسٹ سے بھی ثابت ہو چکا ہے کہ یہ لوگ باہر سے آئے ہوئے ہیں۔

بی جے پی کا ایجنڈا اسرائیل سے ماخوذ ہے۔ اسرائیل کا یہ قانون ہے کہ دنیا کے کسی بھی خطے میں رہنے والا کوئی یہودی اگر اسرائیل کی شہریت حاصل کرنا چاہے گا تو اسے دی جائے گی، یہی فارمولہ بی جے پی ہندوستان میں نافذ کر رہی ہے کہ ہندوستان کے دروازے صرف ہندوؤں کے لیے کھلے ہیں دوسرے لفظوں میں یہ کہ یہ ملک صرف ہندوؤں کا ہے۔ بی جے پی نے ابھی صرف تین مما لک کے ہندوؤں کے لیے دروازہ کھولا ہے حالانکہ ہندو صرف مذکورہ تینوں مما لک میں نہیں رہتے ہیں، بلکہ ملیشیا، انڈونیشیا، متحدہ عرب امارات سمیت دسیوں مما لک میں ہندو آباد ہیں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ ہندو آبادی کو وہاں مکمل مذہبی آزادی، انصاف مساوات اور تحفظ حاصل ہے۔ ان مما لک نے کبھی یہ نہیں کہا کہ ہمیں ہندو برداشت نہیں ہیں۔ کبھی ان مما لک کے حوالے سے گھر واپسی کی خبر سننے کو نہیں ملی۔ ان مما لک نے کبھی وہاں آباد ہندو اور دیگر کمیونٹی سے شہریت ثابت کرنے کا مطالبہ نہیں کیا ہے، مجموعی طور پر ان کی حب الوطنی پر سوال نہیں اٹھایا ہے۔ انٹرنیشنل مذہبی ادارہ کی رپورٹ میں بھی ان مما لک میں مذہبی آزادی کے حوالے سے منفی نہیں ہے۔ دنیا کے بہت سارے مما لک نے ہندوستانیوں کو شہریت دے رکھی ہے، امریکہ، برطانیہ اور کناڈا میں ہندوستانی شہری اب وہاں کی سیاست پر اثر انداز ہو رہے ہیں۔ متحد عرب امارات نے تجارت کرنے گئے ہندوؤں کو باضابطہ مندر بنا کر دیا ہے کہ وہ اپنے مذہبی رسومات کی ادائیگی کرسکیں۔ دوسری طرف ہندوستان کی موجودہ حکومت اپنے ہی شہریوں کو غیر ملکی قرار دینے کی کوشش کر رہی ہے۔ شہریت کے ثبوت کا مطالبہ کر کے عوام، فوج اور پورے سسٹم کو مشکوک قرار دے رہی ہے۔ اپنے شہریوں پر شک کر کے ان کے لیے این آر سی کرانا فوج کی سب سے بڑی توہین ہے کیونکہ ہندوستان کی ہر سرحد پر فوج لگی ہوئی تو پھر دوسرے ملک کے لوگوں کا ہندوستان میں داخلہ کیسے ہوگیا۔ اگر ہوا ہے تو حکومت کے پاس ریکارڈ کیوں نہیں ہے۔ روہنگیا کے بارے میں سرکار کے پاس ریکاڈ موجود ہے تو پھر پاکستان اور بنگلہ دیش سے آنے والے مسلمانوں کا ریکارڈ سرکار کے پاس کیوں نہیں ہے؟ اب تک کتنے

پاکستانی اور بنگلہ دیشی عوام نے ہندوستان کی طرف ہجرت کی ہے۔ سرکار کے پاس کوئی ایک ثبوت اور ڈاٹا نہیں ہے اس کے باوجود سرکار کہہ رہی ہے کہ ہمارے ملک میں بہت سارے بنگلہ دیشی اور پاکستانی ہیں جو در اصل دراندازاور گھس پیٹھے ہیں۔ شہریت ترمیمی بل کے حوالے سے امت شاہ بار بار یہ یقین دہانی کرا رہے ہیں کہ اس بل کا ہندوستان کے مسلمانوں سے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا ان کی آزادی، شناخت، تحفظ، مساوات اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کا اس بل سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ امت شاہ کی یہ حقیقت کے خلاف اور محض جملہ ہے۔ ان جملوں پر اس وقت تک کسی حد تک بھروسہ کرنا ممکن تھا جب اگر این آر سی نافذ کرنے کی بات نہیں ہوتی لیکن وزیر داخلہ یہ بھی صاف لفظوں میں کہہ چکے ہیں کہ وہ ہر حال میں این آر سی بل لائیں گے۔

پہلے شہریت ترمیمی بل کی منظوری اس کے بعد پورے ملک میں این آر سی کا نفاذ اس کارروائی کا واحد مقصد مسلمانوں کو نشانہ بنانا اور انھیں پریشان کرنا ہے، این آر سی میں جن لوگوں کا نام نہیں آئے گا ان میں مسلمانوں کے علاوہ شہریت ترمیمی ایکٹ کی بنیاد پر شہریت ترمیمی ایکٹ کی بنیاد پر شہریت تسلیم کرلیا جائے گا، مسلمانوں کے لیے کوئی آپشن نہیں ہوگا کیونکہ این آر سی کی بنیاد پر وغیرہ ملکی ٹھہرائے جائیں گے اور قانون کے مطابق غیر ملکی مسلمانوں کو ہندوستان شہریت نہیں دے گا۔

یہ قانون یقینی طور پر انسانی حقوق، ملکی دستور اور انصاف کے خلاف ہے تاہم یہ قانون بن چکا ہے جس کا اصل مقصد مسلمانوں کو نقصان پہنچانا ہے جس سے بچنا اور اس سازش کو ناکام بنانا ضروری ہوگیا ہے اور اس کا اثر این آر سی نافذ ہونے کا بعد ظاہر ہوگا۔ اس لیے مستقبل کو سامنے رکھتے ہوئے ابھی سے تین کام اہم اور ضروری ہوگئے ہیں۔ پہلے نمبر پر تمام شہریوں بالخصوص مسلمانوں کو اپنا ڈاکومینٹ بنوالینا چاہیے، جن کے ڈاکومینٹ میں دوسرا کام یہ ہے کہ سپریم کورٹ میں ہم اس بل کو چیلنج کریں، انصاف پسند وکلاء بھی اس کے خلاف عرضیاں داخل کریں، تیسرا یہ کہ ہم اس بل کے خلاف پر امن احتجاج کریں اور یہ مطالبہ برقرار رہے کہ شہریت ترمیمی بل کو ترمیم کرکے مسلمان کو بھی ایڈ کیا جائے اور این آر سی کا ہم مکمل طور پر بائیکاٹ کرنے کی کوشش کریں۔ ڈاکومینٹ کی درستگی اور اس کی تصحیح کرانے کے ساتھ بائیکاٹ کی بات ہم اس لیے کر رہے ہیں کہ دستاویز کا درست رہنا آفیشل کاموں کے لیے ضروری ہے لیکن ہم اپنی شہریت ثابت کرنے کے لیے کسی کو اپنا ڈاکومینٹ نہیں دیں گے۔ کسی کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ ہماری شہریت کو چیلنج کرے۔ ہم ہندوستان کے باعزت شہری ہیں، یہ ملک ہمارا ہے اور ہم ہمیشہ یہیں رہیں گے۔

(آگ ۲۰ دسمبر ۲۰۱۹ء)

☆☆☆

❑ ملکی صورتِ حال

منوسمرتی کی تجدید ہے یہ کالا قانون

زین العابدین ندوی
دارالعلوم امام ربانیؒ، نیرل مہاراشٹر

پورے ملک میں میں افرا تفری اور انتشار کا ماحول ہے، بالخصوص ان صوبوں میں جہاں بھاجپائی حکومت ہے تشدد انتہا پسندی اور بربریت کا بازار بالکل گرم ہے، جہاں نہ تو گھر محفوظ ہیں اور نہ ہی خاندان، اور ظلم کرنے والے بھی وہ لوگ ہیں جو خود کو دیس کا محافظ بتاتے ہیں، اور یہ سب ان ظالموں کے اشارہ پر ہو رہا ہے جن کے ہاتھوں سے معصوموں کے خون ٹپک رہے ہیں، اس کالے قانون اور منحوس ایکٹ کے خلاف نہ صرف یہ کہ بھارت میں بلکہ پوری دنیا میں احتجاج ہو رہا ہے، اور اس ظلم کے خلاف آوازیں بلند کی جا رہی ہیں، ہمیں امید ہے کہ یہ صدائیں رائیگاں نہیں جائیں گی، لیکن اس موقع پر ہمیں یہ سمجھنا ہوگا کہ اس کالے قانون کے ذریعہ یہ ظالم حکمراں کیا چاہتے ہیں؟ اور ان کا منصوبہ کیا ہے؟ اور وہ اس موقف پر اتنی سختی اور بے شرمی سے کیوں اڑے ہوئے ہیں؟

آپ کو ہم یہ بتاتے چلیں کہ بھارت ایک جمہوری ملک ہے جو سبھی جانتے ہیں، اس کی ایک پرانی طویل ترین تاریخ ہے جو تقریبا ۴۰۰۰ سالوں پر محیط ہے، آج سے چار ہزار سال پہلے یہاں کوئی بھید بھاؤ، اونچ نیچ اور ظالمانہ طبقاتی نظام نہیں تھا، مگر جب آرین سماج کے لوگوں نے جو آج برہمن کہلاتے ہیں اس وطن کا رخ کیا، انہوں نے آتے ہی اس ملک کی اصل آبادی دراوڑوں پر ظلم کرنا شروع کیا اور ظالمانہ طبقاتی نظام کی داغ بیل ڈالی، برہمن، کھتری، بنیا اور شودر کی تقسیم کی، جس کے ذریعہ وہ یہاں کے راجہ مہاراجا بن بیٹھے، اور یہاں کی اصل آبادی کو دلت اور شودر گردانتے ہوئے ان کے ساتھ جانوروں سے بھی بدتر سلوک کرنا شروع کیا، یہاں تک کہ انہوں نے ایسے قوانین اور اصول وضوابط مرتب کیا جو سراسر ظلم وزیادتی پر مشتمل تھا، اسی قانونی کو کتاب کو منوسمرتی کا نام دیا گیا، جس کے ذریعہ انہوں نے دلتوں کو ان کی زمین جائیداد مال ودولت یہاں تک کہ بیویوں سے بھی بے دخل کر دیا، اور ان کو اپنا غلام بنا کر رکھنا شروع کیا، یہی وہ کتاب منوسمرتی ہے جس کے ظالمانہ اصول وضوابط کی بنیاد پر بابا صاحب بھیم راؤ امبیڈکر نے اسے سرعام جلا دیا اور اس کے اوراق پھاڑ دیا اور کہا کہ یہ

ظالمانہ قانون یہاں نہیں چل سکتا، اور خود بھی ہندو دھرم چھوڑ کر بودھ مذہب اختیار کر لیا، یہی وہ نظام ہے جس نے ملک کو مختلف ٹکڑوں اور راجواڑوں میں تقسیم کر رکھا تھا، جس کی بیخ کنی کرنے کے لئے اور جڑ سے اس کا صفایا کرنے کے لئے کئی مہا پرشوں نے جنم لیا، گوتم بودھ خود اس کی ایک مثال ہیں، جن کا نعرہ ہی یہ تھا کہ انسانوں کے درمیان اونچ نیچ ظلم ہے، اور پھر جس جس نے اس برہمنی منوسمرتی نظام کے خلاف آواز بلند کیا انہیں سخت اذیتوں سے دوچار ہونا پڑا، بدھسٹوں کو اپنا ہی ملک چھوڑنا پڑا، ان کی لائبریریاں، کالجز جلا دیئے گئے، جس کسی نے بھی اس قانون کے خلاف احتجاج کیا اور لوگوں میں بیداری لانے کی کوشش کی اس کے ساتھ تشدد بھرا معاملہ کیا گیا، لیکن مسلمانوں نے نہ صرف یہ کہ اس ملک کو اکھنڈ بنایا بلکہ اس قانون کو کالعدم کر دیا اور ملکی باشندوں کو امن وسکون اور فرحت وراحت کا ماحول عطا کیا، اور ملک کو سونے کی چڑیا کا خطاب ملا، چونکہ مسلمانوں کے عزم وارادے کے سامنے اس نظام کی ہوا اکھڑ گئی، اور جب تک مسلمانوں کی حکومت رہی جو تقریبا آٹھ صدیوں پر محیط ہے یہ منوسمرتی نظام اپنا سر نہ اٹھا سکا، بلکہ ہر طرف امن وامان اور سلم وسلام کا ماحول بنا رہا۔

لیکن انگریزوں کے قبضہ کے بعد انہیں برہمنوں اور منوسمرتی کے ظالم پجاریوں نے انگریزوں کا ساتھ دیا، جو آج ہمارے سامنے آر ایس ایس اور بھاجپا کی نمائندگی کرتے دکھائی دے رہے ہیں، اور ہندوستانیوں کو نقصان پہونچانے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی، ایسا اس لئے بھی کہ برہمن اصلا انگریز ہی ہیں جنہوں نے روس وجرمن سے آکر ملک میں اپنا بسیرا کیا، جس بنا پر ہندوستانیوں کو اول دن سے تباہ کرنے میں لگے رہے، حالیہ قوانین این آر سی، سی اے اے، اور مشروط این پی آر اسی منوسمرتی عہد کی تجدید کا ایک فارمولہ ہے، جسے وہ مسلمانوں پر نافذ تو کر نہیں سکتے تھے، کیوں کہ ان کے نظام کی ہوا مسلمانوں نے ہی اکھاڑی تھی، اس لئے وہ مسلمانوں کو ملک سے نکال کر باقی ماندہ، او بی سی ایس سی، اور پچھڑے لوگوں پر وہ قانون نافذ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں، اور سی اے اے کا لالی پاپ دے کر ان کو تمام حقوق سے بے دخل کرتے ہوئے ماضی کی طرح اپنا غلام بنا کر رکھنا چاہتے ہیں، اور وہی ظالمانہ طبقاتی نظام عمل میں لانے کی کوشش کر رہے ہیں، اور وقت سے پہلے این پی آر جن بے بنیاد شرائط کے ساتھ لایا جا رہا ہے، وہ بھی اصلا این آر سی کا چور دروازہ ہے، جس کے ذریعہ حکومت کے خلاف اٹھنے والی آوازوں کو دبانے کی کوشش کی جا رہی ہے، اس لئے ہمیں این پی آر کی بھی اتنی ہی شدت سے مخالفت کرنی ہوگی جتنی شدت سے ہم این آر سی اور سی اے اے کی مخالفت کر رہے ہیں۔

اس لئے تمام ہندوستانیوں کو اس غفلت سے باہر آنے کی ضرورت ہے کہ اس میں مسلمانوں کا نقصان ہے، نہیں بلکہ اس میں پورے ملک اور ملک کے تمام باشندوں کا خطرہ ہے، اس لئے اس ایکٹ کے خلاف سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن جاؤ۔

☆☆☆

❑ ملکی صورتِ حال

جب آئین ساز اسمبلی نے مذہبی اقلیتوں کے درد کو درکنار کر دیا

حسب تناسب نمائندگی کے حق سے محرومی کا وبال مسلمان آج تک جھیل رہے ہیں

ابھے کمار، دہلی

برطانوی حکومت نے ۱۶ مئی ۱۹۴۶ء کو جب کیبنیٹ مشن پلان کے تحت آئین ساز اسمبلی کے لیے انتخابات کروائے تھے تو یہ طے کیا تھا کہ ہندوستانیوں کو اقتدار اُن ضابطوں کی بنیاد پر دیا جائے گا جو آئین میں خود انھوں نے بنائے ہوں گے۔ مگر شرط یہ تھی کہ آئین سازی کے وقت اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ کیا جائے گا۔ اقلیتی طبقے سے مراد صرف مذہبی اقلیت (جیسے مسلمان، عیسائی، پارسی) نہیں تھے بلکہ اچھوت (دلت) آدی واسی اور پسماندہ برادری بھی اقلیت کے دائرے میں آتی تھی۔

انتخابات کے دوران مسلمانوں، سکھوں اور جنرل ہندوؤں اور دیگر نے اپنے اپنے نمائندے اُتارے۔ ان انتخابات کا انعقاد متناسب نمائندگی (سنگل ٹرانسفریبل ووٹ) کی بنیاد پر عمل میں آیا تھا۔ کانگریس اور مسلم لیگ نے جنرل اور مسلم نشستوں پر زبردست کامیابی حاصل کی۔ تقسیم ملک کے بعد آئین ساز اسمبلی میں کانگریس کی بالادستی اور بھی مضبوط ہوگئی۔ کل سیٹوں کا ۸۲ فی صد اس کے پاس تھا۔ جب آئین ساز اسمبلی کی کارروائی ۹/دسمبر ۱۹۴۶ء کو شروع ہوئی تو مسلم لیگ نے اس کا بائیکاٹ کیا۔ اسکالر روچنا باجپئی کی تحریریں اس موضوع کو سمجھنے کے لیے کافی اہم ہیں۔ یہ برصغیر کی بدقسمتی ہے کہ دوسو سالوں کی جدوجہد اور قربانیوں کے بعد جو آزادی ملی، وہ خون سے لت پت تھی۔ آزادی کا جشن فرقہ وارانہ فسادات کی چیخوں میں گم ہوگیا۔ اسی دوران آئین ساز اسمبلی کی بحث بھی چل رہی تھی۔ ظاہر ہے کہ جو کشیدگی ایوان سے باہر محسوس کی جارہی تھی اس کا اثر ایوان کے اندر بھی ہونا متوقع تھا۔ روچنا باجپئی آگے لکھتی ہیں کہ مسلمانوں اور سکھوں کی نمائندگی کا دعویٰ کرنے والی جماعتیں، مسلم لیگ اور سکھ پینتھک پارٹی، اس وقت بری حالت میں تھیں اور اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے کوئی متحدہ محاذ کھڑا کرنے میں ناکام رہیں۔ نتیجتاً ان کو جو بھی حقوق برطانوی حکومت نے دیے تھے، ان میں سے بہت سارے چھین لیے گئے۔

۲۷/اگست ۱۹۴۷ء کے روز سردار پٹیل کی قیادت میں ایک مشاورتی کمیٹی نے اپنی رپورٹ آئین ساز اسمبلی میں پیش کی۔ یہ رپورٹ اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ سے متعلق تھی۔ دو دنوں تک اس موضوع پر خوب بحث ہوئی اور ارکان نے اپنا موقف رکھا۔ جب ایوان میں بحث ہو رہی تھی تو پنجاب سمیت برصغیر کے بعض حصے فرقہ وارانہ تشدد کی آگ میں جل رہے تھے۔ تقسیم کے لیے مسلم لیگ کو موردالزام ٹھہرایا جاچکا تھا اور ان کے ارکان کروڑوں مسلمانوں کو اپنے حل پر چھوڑ کر پاکستان چلے گیے تھے۔ لہٰذا آئین ساز اسمبلی میں موجود مسلم ارکان بڑے دباؤ میں تھے۔ بحث کی شروعات میں ہی سردار پٹیل نے

کہہ ڈالا کہ ایک اتفاق رائے قائم ہو چکا ہے کہ آزاد ہندوستان میں ''سپریٹ ایلکٹوریٹ'' (علاحدہ رائے دہندگان کی حمایت) کی جگہ نہیں ہوگی۔ اس کو انھوں نے ایک ''بڑی کامیابی'' سے تعبیر کیا۔ اس کے علاوہ انھوں نے یہ بھی اعلان کیا کہ انتخابات کے دوران اقلیتوں کے امیدواروں کو ''ویٹیج'' نہیں دی جائے گی۔ مگر انھوں نے یہ صاف طور سے کہا کہ ''سپریٹ ایلکٹوریٹ'' کے تحت اقلیتی فرقوں کو متناسب نمائندگی دی جائے گی۔ مگر جب بھارت کا دستور حتمی شکل اختیار کر گیا تو اسے بھی خارج کر دیا گیا۔ ریزرویشن کی پالیسی صرف دلتوں اور آدی واسیوں کے لیے بنائی گئی۔

''سپریٹ ایلکٹوریٹ'' (متناسب نمائندگی) اور ریزرویشن کی منسوخی اقلیتی طبقے پر بڑا حملہ تھا۔ اگر یہ کہا جائے کہ اس نے اقلیتوں کی کمر توڑ ڈالی تو شاید غلط نہیں ہوگا۔ چار دہائیوں سے چلی آ رہی اس پالیسی کی منسوخی کے منفی اثرات ہمارے سامنے ہیں۔ اقلیتوں کی سب سے بڑی جماعت مسلمان نہ تو پارلیمنٹ میں ہی کہیں نظر آ رہے ہیں اور نہ ہی وہ اپنی نمائندگی دیگر سرکاری اور غیر سرکاری اداروں میں ہی حاصل کر پا رہے ہیں۔ آج مسلمانوں کی عدم نمائندگی کی صورت حال اس قدر مایوس کن ہے کہ ۵۴۳ ممبران پر مشتمل لوک سبھا میں مسلم ارکان صرف ۲۰ر کے قریب ہیں، جو تقریبا ۳ فی صد ہے۔ اگر مسلمانوں کو ان کی آبادی کے تناسب سے نمائندگی دی جائے تو ان کے حصے میں کم از کم ۷۵ ایم پیز آنے چاہئیں۔ اس طرح کی تشویشناک صورت حال جو آج دیکھنے کو مل رہی ہے اگر آئین ساز اسمبلی نے ایسے فیصلے نہیں لیے ہوتے اور اگر کمونیٹی کی بنیاد پر بنائی جانے والی پالیسی سے مذہبی اقلیتوں کو الگ نہیں کیا جاتا تو کیا مسلمان آج اس قدر مجبور ہوتے؟ یہ صحیح ہے کہ آئین میں اقلیتوں کے مذہبی اور ثقافتی حقوق کی ضمانت بھی دی گئی اور بعد میں پسماندہ مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد کو ادبی سی گروپ میں لا کر ریزرویشن بھی دیا گیا ہے، مگر یہ سب مسلمانوں کی پسماندگی کو دور کرنے کے لیے کافی نہیں ہوا۔ تبھی تو آج مسلمان کئی حلقوں میں دلتوں سے بھی پیچھے چلے گئے ہیں۔ کیا اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ مذہبی اقلیتوں کے خصوصی حقوق کو کوئی متبادل پیش کیے بغیر اچانک سے ختم کر دیا گیا؟

کمیونٹی کی بنیاد پر نمائندگی فراہم کرانے اور پالیسی بنانے کی تاریخ ہندوستان میں سو سالوں سے بھی پرانی ہے۔ یہ روایت انگریزی حکومت نے شروع کی تھی۔ انگریزوں نے ہندوستان میں رہنے والے لوگوں کو ان کی کمیونٹی اور برادری کے ساتھ دیکھا اور اسی کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنی پالیسی بنائی۔ انھوں نے اقلیتوں کے لیے خصوصی پروگرام متعارف کیے، کچھ کو تو مذہبی اقلیت کہا مگر اقلیت کے زمرے میں اچھوت اور آدی واسی بھی تھے۔ دلتوں کو عرصے سے ''اچھوت پرتھا'' کا شکار بنایا گیا تھا۔ پسماندہ طبقات اچھوت پرتھا کے شکار نہیں تھے مگر وہ اقتصادی، سماجی اور تعلیمی طور سے کافی پیچھے تھے۔ آدی واسی تو اپنے ہی جل، جنگل، زمین اور دیگر وسائل سے محروم کیے جا رہے تھے۔ تبھی تو انگریزوں نے الگ الگ فرقوں کے لیے الگ الگ پالیسی بنائی۔ بہت سارے راجے رجواڑوں نے بھی محکومت طبقوں کو ریزرویشن دیا۔ مثال کے طور پر سال ۱۹۱۸ء میں میسور رجواڑے نے غیر برہمن پسماندہ ذاتوں کے لیے نوکریوں میں ریزرویشن دیا اس سے قبل ۱۹۰۹ء کے آئینی اصلاح کے تحت انگریزوں نے پہلی بار مسلمانوں کے لیے ''سپریٹ ایلکٹوریٹ'' کی شروعات کی۔ ۱۹۱۹ اور ۱۹۳۵ء میں لائے گئے آئینی اصلاح کے تحت مسلمانوں کے ساتھ سکھ، ہندوستانی عیسائی اور دیگر فرقوں کو بھی ''سپریٹ ایلکٹوریٹ'' فراہم کیا گیا۔ مسلمانوں کے لیے نوکریوں میں سب سے پہلے ریزرویشن ۱۹۲۵ء میں انگریزوں نے قبول کیا، جسے ۱۹۳۵ء میں باضابطہ طور سے نافذ کیا جس میں مسلمانوں کے علاوہ دیگر

فرقوں کو بھی شامل کیا گیا۔

مگر ملک کی آزادی اور پاکستان کے قیام نے ہوا بدل دی اور مذہبی اقلیتوں کے حقوق کی بات کرنا مشکل ہوتا چلا گیا۔ ماحول اس طرح سے فرقہ ورانہ سوچ سے متاثر ہونے لگا کہ اقلیتوں، خاص کر مسلمانوں کے لیے بنائی گئی ''سپریٹ الیکٹوریٹ'' اور ریزرویشن کی پالیسی کو انگریزوں کی ''پھوٹ ڈالو اور راج کرو'' کی پالیسی سے جوڑ کر دیکھا جانے لگا۔ یہ بات تیزی سے بہت سارے ہندو سیاست دانوں کے ذہنوں میں بیٹھنے لگی کہ اگر یہ پالیسی نہیں بنی ہوتی تو ملک کب کا آزاد ہوگیا ہوتا اور پاکستان بھی نہیں بنتا۔ وقت کے وقتھ یہ خدشات کم ہونے کے بجائے بڑھتے چلے گئے ہیں۔ اور آج حالات اس قدر خراب ہوگئے ہیں کہ مسلمانوں کی فلاح اور ترقی کے لیے کسی ٹھوس پالیسی کی بات کرنے سے نام نہاد سیکولر جماعت بھی گھبراتی ہے۔

وسطی صوبہ سے تعلق رکھنے والے ڈاکٹر پی سی دیش مکھ نے آئین ساز اسمبلی میں اپنی بات رکھتے ہوئے کہا تھا کہ ''میری رائے میں اقلیت جیسا خوفناک لفظ ہندوستانی سیاست کی تاریخ میں نہیں رہا ہے۔ جب سے ہندوستان سامنے کھڑا ہے اور یہ ملک کی ترقی کو روکے ہوئے ہے۔ اگر تاریخی طور پر دیکھیں تو ہم پائیں گے کہ آنگریزوں نے اسے وجود میں لایا تھا۔ میرے نزدیک اقلیتوں کے شیطان نے اپنا کام کردیا ہے اور سو سالوں سے متحد رہے ہمارے محبوب ملک کو ایک زیادہ حصوں میں تقسیم کردیا ہے''۔ دیش مکھ صاحب کی تقریر آج کے فرقہ وارانہ پروپیگنڈے سے کافی ملتی جلتی ہے۔ ان کی تنگ نظری دیکھیے کہ انھوں نے تقسیم وطن کی ساری ذمہ داری انگریزوں کے سر تھوپ دی جنھوں نے مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے بعض پالیسیاں بنائی تھیں۔ مزید یہ غلط بیانی کہ اقلیت ہی زیادہ تر جگہوں پر اکثریت کے اوپر ظلم اور زیادتی کررہی ہے۔

آسام کی نمائندگی کرنے والے سری وقت روہنی کمار چودھری نے ایوان کو ڈرایا کہ اگر کانگریس پارٹی اسی طرح اقلیتوں کے لیے خصوصی پالیسی لاتی رہی تو دس سالوں کے اندر اقلیت اکثریت بن جائے گی۔ اتنا ہی نہیں انھوں نے سرکار پر بھی تنقید کی اور کہا کہ ایک طرف پاکستان اپنے اکثریت طبقے (مسلمان) کے بارے میں کام کررہا ہے اور دوسری طرف ہندوستان، اقلیت (مسلمان) کے حقوق کے تحفظ کے لیے اپنی پوری طاقت لگا رہا ہے۔

آج جو مسلم مخالف بھگوا پروپگنڈہ چل رہا ہے اس کی گونج چودھری صاحب کی تقریر میں بھی سنی جاسکتی ہے کہ ہندوستان میں اکثریتی طبقہ یعنی ہندو ''مظلوم'' ہے اور سیکولر پارٹیاں مسلمانوں کی ''منہ بھرائی'' کررہی ہیں۔ مدراس کے ایس ناگپا نے بھی اپنی تقریر میں اقلیت مخالف جذبات کا مظاہرہ کیا اور کہا ہے کہ ''اقلیتی فرقوں نے آزادی کی راہوں میں رکاوٹیں پیدا کیں''۔

ان باتوں کو سن کر آئین ساز اسمبلی میں بیٹھے مسلم ارکان کے دل پر کیا گزرتی ہوگی اس درد کو بیان کرنا مشکل ہے۔ مالا بار سے آئے ہوئے بی پوکر صاحب بہادر اٹھ کر کھڑے ہوئے، اُن کو یہ بخوبی معلوم تھا کہ ملک کی صورت حال بدل چکی ہے اور ان کے لیے اقلیتوں کے حقوق کی تائید کرنا بڑا مشکل کام ہوگا۔ اقلیتوں کے وجود کو ختم کرنے کی بات کو خارج کرتے ہوئے پوکر صاحب نے کہا کہ ضرورت اس بات کی ہے کہ ملک کی اکثریت اور اقلیت کے درمیان ''فرق'' کو کم کیا جائے۔ یہ انسانی فطرت ہے کہ ہر سماج میں اقلیتی اور اکثریتی فرقے ہوں گے۔ ہندوستان جیسے بڑے ملک میں ایسا ہونا تو لازمی ہے۔ یہ بھی کسی انسان کے لیے ممکن نہیں ہے کہ وہ اقلیتوں کے وجود کو پوری طرح سے مٹادے۔ اس لیے ہمیں اُن کے درمیان فرق کو کم کرنا چاہیے تاکہ اقلیتیں خود کو مطمئن محسوس کریں''۔ ملک کے حالات کو دیکھتے ہوئے پوکر صاحب کے پاس اپنی دلیل پیش کرنے کے لیے وہ

الفاظ نہیں تھے جو وہ کہنا چاہتے تھے۔ اگرچہ انھوں نے اکثریتی سماج سے اپیل کی کہ وہ ''کشادہ دلی'' کے جذبے کے ساتھ اقلیتوں کے مسائل کو دیکھیں۔ آگے انھوں نے ''سپریٹ ایلکٹوریٹ'' کا دفاع کیا اور کہا کہ یہ نظام اس بات کو یقینی بنائے گا کہ اقلیتی سماج سے مناسب امیدوار منتخب ہوکر قانون ساز اسمبلی میں جائے گا اور ان کے مفاد کی صحیح ترجمانی کرے گا۔ انھوں نے ''جوائنٹ ایلکٹوریٹ'' کی خامیوں کو بھی اجاگر کیا، جس کو آج ہم اور بھی بری حالت میں دیکھ رہے ہیں۔

جوائنٹ ایلکٹوریٹ کی پہلی ناکامی یہ ہے کہ اس میں اقلیتی طبقے حکومت سازی کی کاروائی سے باہر ہوجاتے ہیں۔ یہی نہیں اس سسٹم کے تحت اقلیتوں کو اپنی مستحقہ نمائندگی محفوظ رکھنا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ اقلیتی سماج سے امیدوار منتخب ہو بھی جائیں تو وہ اپنی کمیونٹی کے مفاد کا تحفظ نہیں کر پاتے ہیں، کیونکہ ان کے اوپر اپنی پارٹی کا دباؤ ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر تین طلاق سے متعلق بل کے دوران مسلم ارکان پارلیمنٹ مسلم سماج کے مفاد کا تحفظ نہیں کر پائے۔

''اقلیتی فرقے کے سب سے قابل انسان کو اس فرقے کے خیالات کی ترجمانی کرنے کی موقع ملنا چاہیے۔ یہ کام سپریٹ ایلکٹوریٹ کے علاوہ کوئی اور دوسرا نظام نہیں کرسکتا ''پوکر صاحب نے یہ بات صاف طور پر کہی۔ آخر میں انھوں نے کہا کہ سپریٹ ایلکٹوریٹ گذشتہ ۴۰ سالوں سے نافذ تھا اور اس کو اچانک ختم کردینا مسلمانوں کے لیے بہت مایوس کن فیصلہ ہوگا۔ کچھ ایسی طرح کی بات اتر پردیش سے منتخب رکن چودھری خلیق الزماں نے بھی کہی۔ انھوں نے ممبران سے اپیل کی کہ اس مسئلے کو ماضی میں دیکھنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے اور نہ ہی اس سے ڈرنے کی ضرورت ہے۔

کسی بھی انصاف پسند اور غیر جانبدار محقق کو یہ کہنے میں کوئی جھجک نہیں ہونی چاہیے کہ آزادی کے وقت مسلمانوں کے درد کو سنا نہیں گیا اگر ''سپریٹ ایلکٹوریٹ'' کو ختم کرنا ایک نئے ملک کے لیے اتنا ہی ضروری تھا تو کیا اس کی جگہ کوئی دوسرا میکنزم نہیں لایا جانا چاہیے تھا؟

مگر اتر پردیش کے ہی دوسرے رکن پنڈت گوبند بلبھ پنت نے خلیق الزماں کی بات کاٹی اور کہا کہ سپریٹ ایلکٹوریٹ اقلیتوں کے لیے ''خودکشی'' کرنے کے مترادف ہوگا۔ اپنی دلیل میں انھوں نے کہا کہ مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ اس بات میں ہیں کہ وہ ریاست کے وجود میں ضم ہوجائیں۔

اس بات کا بھی ذکر کم ہی ہوتا ہے کہ آخر میں قانون ساز اسمبلی اور نوکریوں میں ریزرویشن صرف دلتوں اور آدی واسیوں کو دیا گیا اور مسلمانوں کو آخری لمحات میں اس پالیسی سے باہر کردیا گیا۔ اس کے حق میں بھی جو دلیل دی گئی وہ یہ تھی کہ اس پالیسی سے دلتوں کے مین اسٹریم (ہندو سماج) میں ضم ہوجانے میں آسانی ہوگی۔

آئین ساز اسمبلی کی تقریروں کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کی کہ مسلمانوں کی مخصوص مذہبی اور ثقافتی تشخص کی وجہ سے اُن کو ریزرویشن کی پالیسی سے دور رکھا گیا ہے، باوجود اس کے کہ سردار پٹیل کی قیادت والی مشاورتی کمیٹی نے مسلمانوں کے لیے پہلے متناسب نمائندگی پر مبنی ریزرویشن کی سفارش کی تھی۔ یہ سب دیکھ کر کسی بھی انصاف پسند اور غیر جانب دار محقق کو یہ کہنے میں کوئی جھجک نہیں ہونی چاہیے کہ آزادی کے وقت مسلمانوں کے درد کو سنا نہیں گیا۔ اگر ''سپریٹ ایلکٹوریٹ'' کو ختم کرنا ایک نئے ملک کے لیے اتنا ہی ضروری تھا تو کیا اس کی جگہ کوئی دوسرا میکنزم نہیں لایا جانا چاہیے تھا؟ آج جب کہ مسلمانوں کی پسماندگی کے مستند ریکارڈ خود حکومت شائع کرچکی ہے، تو کیا یہ انصاف کا تقاضا نہیں ہے کہ دیر ہی سے سہی اقلیتوں کے درد کو کم از کم اب تو سنا جائے؟

(مضمون نگار جے این یو میں ریسرچ اسکالر ہیں)

☆☆☆

❑ ملکی صورتِ حال

اندلس میں قانونِ شہریت کا نفاذ

کیا اب اسے ہندوستان میں دوہرانے کی تیاری ہے؟

پروفیسر نگار سجاد ظہیر

اسلامی تاریخ کے الم ناک برسوں میں سے ایک زوال غرناطہ کا سال ۱۴۹۲ ہے۔ ساڑھے سات سو سال حکومت کرنے کے بعد، پورے اندلس میں صرف غرناطہ وہ شہر تھا جہاں مسلمانوں کی حکومت باقی بچی رہی تھی۔ شمال کی عیسائی ریاستیں رفتہ رفتہ جنوب میں، مسلمانوں کے ایک ایک علاقے پر قبضہ کرتی رہیں، سب سے پہلا شہر جو مسلمانوں کے ہاتھ سے نکلا وہ طلیطلہ Toledo تھا اور دو سو سال بعد جو آخری شہر مسلمانوں کے ہاتھ سے گیا وہ غرناطہ تھا۔

اس کے بعد غرناطہ کے مسلمانوں پر جس طرح عرصہ حیات تنگ کیا گیا، وہ مسیحی تاریخ کا تاریک ترین باب ہے، جب مسلمانوں نے اندلس فتح کیا تھا تو یہاں کی عیسائی اور یہودی آبادیوں کے ساتھ جو انتہائی روادارانہ برتاؤ کیا وہ مسلم تاریخ کا درخشاں باب ہے۔ جس پر ایک مسلمان آج بھی فخر کرسکتا ہے۔

سقوط غرناطہ کے بعد عیسائی بادشاہ فرڈیننڈ اور اس کی بیوی از بیلا نے ابتدا میں یہ کوشش کی کہ مسلمان خود ہی عیسائیت اختیار کرلیں، لیکن جب مسلمانوں نے ترک مذہب کو رد کردیا تو مختلف مواقع پر مختلف قوانین شہریت بنا کر مسلمانوں کو اسپین سے مٹادیا گیا۔

۱۴۹۹ میں پہلا شاہی فرمان یہ آیا کہ جو مسلمان، عیسائیت قبول نہیں کرتا اسے اسپین سے نکل جانا ہوگا۔ لہٰذا مسلمانوں کی جمعیت کی جمعیتیں شمالی افریقہ کی طرف ہجرت پر مجبور ہوئی ...... یہ پر امن ہجرت نہیں تھی ...... طول طویل راستوں میں مہاجرین کے یہ قافلے لوٹ لیے جاتے ...... مزاحمت کی صورت میں قتل عام ہوجاتا۔ جو لوگ لوٹ مار اور قتل و غارت گری سے بچ جاتے، وہ موسم کے شدائد، بھوک پیاس اور بیماریوں سے مرجاتے۔

اسپین سے صرف مسلمانوں کو ہی بے دخل نہیں کیا گیا بلکہ یہ حکم یہودیوں کے لیے بھی تھا۔ یہودی چونکہ اندلس کے معاشرے کا سب سے متمول طبقہ تھے۔ لہٰذا انھوں نے تجارتی کشتیوں پر اجتماعی نقل مکانی کی اور یوروپی ممالک کی طرف چلے گیے۔ اس زمانے میں مشرقی یوروپ کے بیشتر ممالک سلطنت عثمانیہ کے زیر تسلط تھے۔ لہٰذا یہ مسلمان عثمانی خلیفہ کی اجازت سے ترکی اور مشرقی یوروپ میں آباد ہوگئے۔

۱۵۲۴ کے لگ بھگ غرناطہ میں ''مذہبی تفتیشی

عدالتیں'' قائم کی گئیں۔ ہجرت نہ کرنے والے مسلمانوں کو ان عدالتوں میں پیش کیا جاتا، اگر وہ جج کے سامنے عیسائیت قبول کر لیتے تو ان کے پورے خاندان کو بپتسمہ دے دیا جاتا دوسری صورت میں انھیں آگ کے الاؤ میں پھینک دیا جاتا۔ ان عدالتوں کے فیصلوں کے مطابق ایک دو نہیں ہزاروں مسلمانوں کو باب الرہلہ کے چوک پر اسی غرض سے بھڑکائے جانے والے الاؤ میں پھینک دیا جاتا اور وہ بھسم ہو جاتے۔ یہ واقعات مسلمان مؤرخین ہی نے نہیں بلکہ اسکاٹ اور گستاؤ لیبان سمیت متعدد عیسائی مغربی مؤرخین نے بھی اپنی کتابوں میں درج کئے ہیں۔

جب ہزاروں مسلمان جلا دئے اور قتل کر دیئے گئے تو حکومت خود پریشان ہوگئی کہ آخر کتنوں کو قتل کیا جائے تو انھوں نے مسلمانوں کو اجازت دے دی کہ وہ اپنے مذہب پر قائم رہ سکتے ہیں مگر انھیں مذہبی ٹیکس ادا کرنا پڑے گا۔ سالانہ بنیادوں پر لگایا جانے والا یہ بہت بھاری ٹیکس تھا جسے طبقہ امرا ہی برداشت کر سکتا تھا۔

وہ اسپینی مسلمان جنھوں نے ہجرت نہیں کی، مذہبی عدالتوں کے قتل عام سے بچنے کے لیے عیسائیت تو قبول کر لی لیکن در پردہ مسلمان ہی رہے ..... وہ گھر میں احمد، عبداللہ، محمد، عائشہ اور فاطمہ ہوتے تو گھر سے باہر ڈیوڈ، جون، مائیکل، میری ور ماگریٹ ہوتے۔ گھر میں عربی بولتے باہر اسپینی، گھر میں نماز پڑھتے، اتوار کو چرچ کے ماس میں شرکت کرتے۔ اپنے بچوں کو گھر میں قرآن پڑھاتے جب یہ بچے اسکول جاتے تو ان کے گلے میں صلیب لٹکا دیتے۔

پھر ۱۵۶۶ میں ایک اور قانون آ گیا کہ کوئی باشندہ عربی نہیں بول سکتا، نہ ہی عربی لباس پہن سکتا ہے، جو اس کا ارتکاب کرتا اس پر ''فرضہ'' یعنی ایک بھاری ٹیکس لگ جاتا۔ عورتوں کا پردہ تو پہلے ہی ممنوع تھا اب یہ حکم بھی ملا کہ جمعہ کے دن سارے مسلمان اپنے گھروں کے دروازے کھلے رکھیں گے۔ اصل میں مسلمان چوری چھپے جمعہ کی جماعت گھروں میں قائم کرنے لگے تھے، اس لیے یہ قانون بن گیا۔

عربی پر پابندی لگی تو ہر گھر کی تلاشی کے بعد ہزاروں عربی کتابیں جمع کر کے باب الرہلہ کے چوک میں سپرد کے حکم سے صرف غرناطہ میں سپرد آتش کی جانے والی عربی کتابوں کی تعداد اسی ہزار ۸۰۰۰۰ تھی۔ اس میں قرآن کے وہ نسخے بھی تھے جو مسلمان چھپا کر رکھتے اور اپنے بچوں کو پڑھاتے تھے۔ اس کے علاوہ تاریخ، ادب، فقہ، حدیث، تفسیر فلسفہ، کلام، طب، طبعیات، فلکیات وغیرہ وغیرہ کی کتب، جو آٹھ سو سال میں مشرق و مغرب سے لا کر جمع کی گئی تھیں گھروں اور لائبریوں سے نکال کر جلا دی گئیں۔

۱۶۰۴ میں مسلمانوں کے حوالے سے آخری قانون شہریت یہ آیا کہ مسلمان سرزمین اندلس کو بالکل خالی کر دیں۔ چنانچہ دو سال کے عرصہ میں تقریباً پانچ لاکھ مسلمانوں نے اندلس کو خیر باد کہہ دیا، زیادہ تر افریقہ میں یا جہاں انھیں پناہ ملی، چلے گئے۔ ان میں سے ایک تہائی لوگ راستہ ہی میں یا قتل کر دیئے گئے یا خود مر گئے۔ اور ۱۶۰۶ کے بعد اسپین میں ایک مسلمان بھی باقی نہ رہا۔

☆☆☆

❑ ملکی صورتِ حال

این آر سی کو واپس لینا کیوں ضروری ہے؟

تحریر: چیتن بھگت

ترجمہ: نایاب حسن

این آر سی کی وجہ سے پورے ملک میں زبردستی تنازع، پولرائزڈ آر ااور بے اطمینانی پیدا ہوگئی ہے اور لوگ سڑکوں پر نکل گئے ہیں۔اس وقت مرکزی حکومت بیک فٹ پر ہے،مگر اس کے باوجود اس نے وہ نہیں کیا ہے جو کرنا چاہیے،یا تو آفشیلی اسے واپس لے لینا چاہیے یا لمبے وقت کے لیے ٹھنڈے بستے میں ڈال دینا چاہیے،اس کو اَنا کا مسئلہ نہیں بنانا چاہیے۔یہ کہا جاسکتا ہے کہ نظریاتی اعتبار سے این آر سی کا خیال برا نہیں ہے،مگر اسے عمل درآمد کرنا ایک مشکل کام ہوگا اور ہندوستان کی زمینی صورتِ حال کی روشنی میں اس کے فوائد بھی سوالات کی زد میں آجائیں گے۔اگر آج کے ہندوستان میں این آر سی نافذ کیا جاتا ہے،تو اس کے بے شمار تباہ کن نتائج سامنے آئیں گے۔اس کی جو بہتر سے بہتر حالت ہوسکتی ہے،اس میں بھی یہ ایک نہایت مہنگا،بے معنی اور افراتفری پھیلانے والا اقدام ہوگا اور جو بری صورتِ حال ہوگی،وہ یہ کہ اس کی وجہ سے پورے ملک میں خانہ جنگی کی کیفیت پیدا ہوجائے گی۔اگر کوئی یہ سوال کرتا ہے کہ جب ابھی این آر سی کا پیمانہ،طریقۂ کار اور شہریت ثابت کرنے کے طریقے کے بارے میں تفصیلات سامنے نہیں آئی ہیں،تو ایسے میں اس پر ردِعمل ظاہر کرنا کیسے مناسب ہوسکتا ہے؟ تو جواب یہ ہے کہ یہی تو پرابلم ہے،پیمانے یا معیار کا تو مسئلہ ہی نہیں ہے،سو کی سیدھی بات یہ ہے کہ اس وقت ہندوستان میں این آر سی نافذ نہیں کیا جاسکتا۔اگر اس کا پیمانہ و معیار نہایت سمپل ہو پھر بھی تقریباً ہر ہندوستانی کو اس سے گزرنا تو ہوگا۔اگر مطالبے کے مطابق شہریت کے ثبوت میں تین گواہ اور شناختی کارڈ موجود ہوں،پھر بھی ہندوستان میں رہنے والے ہر شخص کو این آر سی سے گزرنا ہوگا۔گویا پھر قطار بندی ہوگی،سیکڑوں کاغذی کارروائیاں کروانی ہوں گی،لوگ پریشانیوں سے دوچار ہوں گے،غلطیاں سرزد ہوں گی اور عوام کو ہندوستانی بیوروکریٹ کی روایتی بداخلاقی و بدتمیزی کا سامنا کرنا پڑے گا۔بلاشبہ یہ دوبارہ آدھار کارڈ بنوانے جیسی مصیبت ہوگی اور چوں کہ ہر شخص یہ کاغذات بنوالے گا،تو آخر میں اس سارے عمل کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا اور گویا ہم غلطیوں سے بھرے شہریوں کا رجسٹر تیار کرنے کے لیے بے شمار روپے،وقت اور اسباب و وسائل خرچ کریں گے۔

دوسرے سینار یو میں جب این آر سی کے معیار کو نہایت سخت کردیا جائے،تو اس صورت میں یہ اور سنگین ہوجائے گا۔یہ اس وقت ہوگا جب آپ سے شہریت کے اثبات کے لیے اہم تاریخی کاغذات مانگے جائیں گے،پرانے زمانے کا برتھ سرٹیفکیٹ دکھانا ہوگا۔جہاں لوگ پیدا ہوئے تھے ممکن ہے اب وہ ہسپتال بھی ختم ہوگئے ہوں،گاؤں کا جو افسر برتھ سرٹیفکیٹ ایشو کرتا تھا،ممکن ہے وہ مر چکا ہو۔جو لوگ اپنے گھر میں پیدا ہوئے وہ کیا کریں گے؟ ان کے پاس اپنی پیدائش کا سرٹیفکیٹ کہاں سے آئے گا؟ جتنے شناخت نامے ہیں،سب بیکار ہوجائیں گے۔اس صورت میں سارے ہندوستانی غیر ملکی ہوجائیں گے،جب تک کہ وہ مطلوبہ کاغذات دکھا نہ دیں۔جو لوگ مالدار ہیں،وہ تو کسی طرح اس مرحلے سے نکل بھی سکتے ہیں،مگر غریب ہندوستانی پھنس جائے گا،وہ گڑگڑائے گا،ہاتھ پھیلائے گا اور سرکاری بابو

اپنی اضافی طاقت وقوت پر اِترائے گا، پھر ایک ریٹ اور قیمت فکس ہوگی اور یہ ریٹ اتنا ہی ہائی ہوگا، جتنا کہ این آر سی کا معیار ہائی ہوگا۔ پھر فرضی دستاویزات کا پنگا کھڑا ہوگا، کیا پرانے برتھ سرٹیفکیٹ کی فوٹو شاپ کاپی تیار کرنا مشکل ہے؟ اور اگر آپ طے شدہ قیمت (رشوت) نہیں دیتے ہیں، تو کیا سرکاری بابو آپ کے صحیح کاغذات کو بھی مسترد نہیں کرسکتا ہے؟ (پھر اس کے بعد ان کاغذات کا استناد ثابت کرنے کے لیے بیس سال تک کورٹ کے چکر لگاتے رہیے) یہ چیزیں درست نہیں ہیں۔ دیوار سے لگائے گئے لوگ احتجاج تو کریں گے ہی، کچھ احتجاجات میں تشدد بھی رونما ہوسکتا ہے اور اخیر میں این آر سی بھی ہوسکتا ہے، مگر یہ حقیقت ہے کہ شہریوں کے ڈیٹا کے ساتھ ملک کا امن وامان بھی تباہ ہو جائے گا۔ اسی وجہ سے اس سے قطع نظر کہ معیار کیا ہوگا، ہندوستان کے زمینی حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے یہاں این آر سی کام نہیں کرسکتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ہم 2020 کے بعد پیدا ہونے والے بچوں کی تفصیلات جمع کرلیں اور آنے والی دہائیوں میں ایک بہتر رجسٹر تیار کیا جاسکتا ہے، مگر ابھی یہ کام شروع نہیں کیا جاسکتا۔

ایک سوال یہ ہے کہ ہم ایسا کیوں کرنا چاہ رہے ہیں؟ غالباً اس خیال سے کہ ملک کے اصلی شہریوں اور گھس پیٹھیوں کا پتا لگایا جائے، جو ملک کے وسائل کا استعمال کررہے ہیں۔ مگر یہ تصور ہی غلط ہے؛ کیوں کہ ملک کی جی ڈی میں تو وہ بھی حصہ ڈالتے ہیں؛ لیکن اگر ان گھس پیٹھیوں کی حصے داری کو ایک طرف ڈال بھی دیا جائے اور ملک میں ایک بہتر این آر سی ہوجائے، پھر پورے ملک میں ایک تبدیلی رونما ہو اور تمام ہندوستانی ایماندار ہو جائیں، خوبصورت فائلوں میں لوگوں کی شہریت کے کاغذات جمع ہوں اور سارے بیوروکریٹس شایستگی وخندہ روئی کے ساتھ کام کرنے لگیں اور لوگوں کے ساتھ ذلت آمیز حرکات نہ کریں، تو اس صاف ستھرے این آر سی کے بعد پانچ فیصد لوگ غیر ملکی شہری رہ جائیں گے، ان کی تعداد چھ کروڑ سے زائد ہوگی، جو کہ برطانیہ کے شہریوں کی مجموعی تعداد ہے، پھر آپ ان کے ساتھ کیا کریں گے؟ کونسی فلائٹ سے آپ ان تمام لوگوں کو ایک ساتھ باہر کریں گے؟

اب آپ سوچیے کہ کونسا کام آسانی سے کیا جاسکتا ہے .....ان چھ کروڑ لوگوں کی شناخت کرنا اور انھیں ہندوستان سے باہر کرنا یا سمپل انداز میں ملکی جی ڈی پی میں تیزی سے پانچ فیصد اضافہ کرتے رہنا؟ اگر یہ گھس پیٹھیے ہماری دولت کا استعمال کر بھی رہے، تو بھی ان کی شناخت اور تعیین مشکل ہے، جبکہ اس کے مقابلے میں مزید دولت کے ذرائع کو فکس کیا جاسکتا ہے۔ اگر مزید آم کے درخت لگا کر فائدہ حاصل کرنا آسان ہو، تو آپ یہ کریں گے یا ان بچوں کے پیچھے بھاگیں گے، جنھوں نے آپ کے پیڑ سے کچھ آم توڑ کر کھالیے ہوں؟ این آر سی حاضری لینے جیسا ہے، مگر آپ یہ کام ہندستان جیسے ایک مصروف ترین ٹرین پلیٹ فارم پر نہیں کرسکتے۔ اس سے تو محض انتشار و بدنظمی پیدا ہوگی، غلطیاں ہوں گی، جھگڑے ہوں گے، بہت سے لوگوں کی ٹرین چھوٹ جائے گی اور بہت سے لوگ تو افراتفری میں پٹریوں پر گر کر مر جائیں گے۔

این آر سی کے نفاذ کی عملی مشکل ہی ایک سبب نہیں ہے کہ اسے ملتوی کیا جائے، اقلیتوں کے اندر بی جے پی کے تئیں بے اعتمادی حد سے زیادہ بڑھی ہوئی ہے۔ بی جے پی لیڈرشپ کی امیج آمرانہ اور خوفناک ہے۔ مناسب ہو یا غیر مناسب، مگر آپ تصور کیجیے کہ منموہن سنگھ کے اور امیت شاہ کے کاغذات مانگنے میں فرق ہے یا نہیں؟ اس کے علاوہ این آر سی کی ٹائمنگ بھی درست نہیں ہے۔ کشمیر سے آرٹیکل ۳۷۰ کے خاتمے اور ایودھیا فیصلے کو ہندوستان کے بعض حلقوں میں ہندوؤں کی فتح کے طور پر دیکھا گیا ہے۔ یہی طبقہ این آر سی کو بھی ہندوؤں کے حق میں سمجھتا ہے (حالاں کہ ایسا نہیں ہے، این آر سی کی مصیبت اور دشواریاں سیکولر ہوں گی اور سب کو جھیلنا پڑیں گی) اس وجہ سے ایک کے بعد دوسرے اس قسم کے ایشوز کو اچھالنے سے ایک کمیونٹی مزید دیوار سے لگ جائے گی۔ یہ وقت این آر سی کی بجائے ملکی معیشت پر کام کرنے کا ہے۔ ہندوستان اس وقت کسی قسم کے خلفشار و انارکی کو جھیلنے کی پوزیشن میں نہیں ہے۔ معیشت پر ابھی کام کرنے کی بہت زیادہ ضرورت ہے، ہمیں اسی کو اپنی پہلی ترجیح بنانا چاہیے، این آر سی کو فی الحال باضابطہ سرد بستے میں ڈالنے کی ضرورت ہے۔ ☆☆☆

□ملکی صورتِ حال

''ہم بھی دیکھیں گے.....''

از: ابوفہد

فیض احمد فیض کی مشہور نظم ''ہم بھی دیکھیں گے'' جو سیاست کی بالادستی اور ناانصافیوں کے خلاف بغاوت کا اعلامیہ بن چکی ہے، چونکہ اردو میں لکھی گئی ہے اور شاعر اپنے عقیدے کے اعتبار سے مسلمان ہے، اس کا مطالعہ مشرقی علوم اور مشرقی زبانوں کا بہت زیادہ ہے اس لیے لازمی طور پر ایسا ہے کہ نظم کی زمین مشرقی مہا بیانیوں کے علامتی لفظ وصوت اور تصور وخیال سے بھر گئی ہے۔ اور یہ بالکل فطری ہے، کوئی بھی نظم جس زبان میں لکھی جاتی ہے اسی زبان کے مہاوروں، کہاوتوں، علامتوں ،استعاروں اور تشبیہات وتلمیحات بلکہ خود شاعر کے ایمان و مذہب کو ظاہر کرنے والی علامتوں اور صوتیات سے مملو ہوتی ہے اور جب تک لفظ اور علامتوں کا برتاو منفی نہیں ہے، تب تک اس میں کچھ برائی بھی نہیں۔ اس کے برعکس اگر ظلم کی مخالفت اور آزادیوں کی حمایت کی بات ہے تو یہ ہر طرح سے پروگریسو ہے اور اس کی ہر حال میں تائید کی جانی چاہیے۔

یہ نظم اس وقت لکھی گئی تھی جب فیض امریکہ میں مقیم تھے اور وطن سے دور اپنے اس قیام کو جلاوطنی سے بھی تعبیر کرتے تھے، یہ نظم فیض کے دیوان ''مرے دل مرے مسافر'' میں شامل ہے۔ اس کا عنوان ''ویبقیٰ وجہ ربک'' ہے، جو سورۂ رحمان کی آیت کا ایک ٹکڑا ہے۔ یہ نظم ڈکٹیٹرشپ کے خلاف بغاوت کا اعلامیہ ہے اور جمہور کی حکومت کا مژدہ سنانے والی ہے۔ اس میں یہ دعویٰ بہت یقین کے ساتھ دوہرایا گیا ہے کہ حالات ایک دن یقیناً بدلیں گے۔ شاعر کے دل میں یقین کی یہ کیفیت قرآن کے بیانیہ اور اس پر اعتماد ویقین سے بھی پیدا ہوئی ہے۔ اوران ادبی وسیاسی سرگرمیوں اور وابستگیوں سے بھی، جن سے وہ عمر بھر وابستہ رہے۔ اقبال اور رومی تو ان کے پسندیدہ شاعر رہے ہیں۔

اس نظم میں جتنے بھی ایسے الفاظ آئے ہیں جو مذہبی شعار اور علامات کے حوالے سے جانے پہچانے ہیں جیسے کعبہ وبُت اور حرم وانا الحق وغیرہ، حقیقت یہ ہے کہ یہ سب الفاظ علامتی اور استعاراتی معنیٰ میں استعمال ہوئے ہیں، ان میں سے کوئی بھی حقیقی معنیٰ میں استعمال نہیں ہوا۔ بُت سے مراد بھی ہندو مذہب کے دیوی ودیوتاؤں کی کوئی مورتی نہیں ہے بلکہ ظالم حکمراں اور نامراد اہل سیاست مراد ہیں۔ اردو شاعری میں بُت کا استعمال بہت کثرت اور بہتات کے ساتھ ملتا ہے۔ اور اکثر جگہ اس سے معشوق مراد ہوتا ہے، خاص کر وہ ، جو شوخ اور بے پرواہ ہے جو محبت کا مثبت جواب نہیں دیتا۔ پنڈت دیا شنکر نسیم لکھنوی نے کہا ہے:

لائے اس بت کو التجا کر کے
کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے

نسیم کے اس شعر میں ''بُت'' سے مراد کوئی مورتی نہیں ہے اور نہ ہی '' کفر'' کا اشارہ کسی غیر مسلم کی طرف ہے، بلکہ بت سے مراد معشوق ہے اور کفر سے مراد اس کی ضد اور 'نہیں نہیں' ہے۔

فیض کی نظم میں اللہ کا نام بے شک حقیقی معنیٰ میں استعمال ہوا ہے اور اس نظم کی یہی لائن ''بس نام رہے گا اللہ کا'' اس نظم اور اس کے عنوان میں ربط پیدا کرتی ہے۔ مگر یہاں لفظ 'اللہ' کے استعمال کی وجہ یہ ہے کہ نظم اردو زبان میں ہے اور شاعر اللہ کی ذات میں عقیدہ (آستھا) رکھتا ہے۔ اگر شاعر غیر مسلم ہوتا یا نظم دوسری زبان میں ہوتی تو اللہ کے سوا کوئی دوسرا لفظ ہوسکتا تھا جیسے مالک، بھگوان اور گاڈ وغیرہ۔ اسی طرح 'حرم' اور 'کعبہ' بھی ایوان سیاست کی اعلیٰ مسندوں کے معنیٰ میں استعمال ہوئے ہیں۔ اور یہ اسی طرح ہے جس طرح عدالتِ عالیہ کو ''انصاف کا مندر'' کہا جاتا ہے۔ اور ظاہر سی بات ہے کہ ایسا کہتے وقت حقیقی مندر مراد نہیں ہوتا اور نہ ہی عدالتِ عالیہ کو مندر بتانا مقصود ہوتا ہے۔

''ہم دیکھیں گے/ لازم ہے کہ ہم دیکھیں گے''

اس میں دو نوعیت کا مضمون ہے۔ ایک یہ کہ دیکھتے ہیں اللہ ظلم کو مٹانے اور انصاف قائم کرنے کا اپنا وعدہ کس طرح پورا فرماتا ہے اور دوسرے یہ کہ اللہ کا یہ وعدہ سچ ہوکر رہے گا اور ہم (یعنی انسان، نہ کہ خود فیض) اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھ لیں گے۔

''وہ دن کے جس کا وعدہ ہے/ جو لوح ازل میں لکھا ہے''

یہاں وعدے کے دن سے قیامت کا دن مراد نہیں ہے اور نہ ہی لوح ازل سے محض قرآن مراد ہے، جیسا کہ بعض اہل قلم نے بتانے کی کوشش کی ہے۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے قوانین فطرت میں بھی اور قوانین شریعت میں بھی اللہ کا یہ اصول اور وعدہ ہے کہ ایک دن ایسا ضرور آتا ہے جب ظالم بے موت مارا جاتا ہے اور مظلوم سرخ رو ہوتا ہے۔ موسیٰ و فرعون کی لمبی داستانِ دلخراش میں ایک دن وہ بھی آیا جب فرعون غرقاب ہوا اور موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم سرخ رو ہوئی۔ یہی بات قرآن میں اس طرح لکھی ہے۔ جاء الحق وزھق الباطل۔ جس طرح فرعون کا غرق ہونا دنیا میں ہی ہوا، اسی طرح یہ بھی دنیا ہی میں ہوتا ہے کہ باطل کا چراغ گل ہوتا ہے اور حق کی شمع روشن ہوتی ہے۔ اس لئے ''وعدے کے دن'' سے قیامت کا دن مراد لینا درست نہیں اور ''لوح ازل'' سے قرآن ہی سمجھنا بھی غلط ہوسکتا ہے۔ اس میں ابتدائے آفرینش کے معنی بھی ہوسکتے ہیں۔ اسی طرح نظم میں زمین کے دھڑ دھڑ دھڑکنے اور بجلی کے کڑکڑ کڑکنے کی صوتیات کی خام بنیادیں قرآنی بیانیہ میں تلاش کرنا بھی دور کی کوڑی لانے کے مترادف ہے۔ مگر کئی قلم کاروں نے یہ کوشش بھی کر ڈالی ہے۔

''جب ارضِ خدا کے کعبے سے/ سب بت اٹھوائے جائیں گے''

ارضِ خدا کے کعبے سے یعنی اللہ کی زمین کے قابل احترام مقامات اور ایوان سیاست سے، جب ظالم حکمرانوں کو بے عزت کرکے نکالا جائے گا۔ بالکل اسی طرح جس طرح بیت اللہ سے بتوں کو نکالا گیا تھا۔ یہاں تلمیحا اس واقعے کی طرف اشارہ ہے، جب بیت اللہ الحرام کو بتوں سے پاک کیا گیا تھا، مگر مقصود آج کے زمانے کے ظالم حکمرانوں سے سیاست کے ایوانوں کو پاک کرنا ہے۔ اور مردودِ حرم، (سیاست کے محل اور ایوانوں سے دھتکارے ہوئے لوگ) یعنی عوام کو ایوان سیاست کی اعلیٰ مسندوں پر بٹھایا جائے گا۔ آج کی دنیا میں جو دھتکارے ہوئے لوگ ہیں اور دبے کچلے انسان ہیں، جلد ہی وہ دن بھی آئے گا جب وہ سیاسی و مذہبی محلوں اور ایوانوں کی اعلیٰ مسندوں پر جلوہ افروز ہوں گے اور یہ ہوکر رہے گا کیونکہ قدرت کے کارخانے میں ہمیشہ

سے یہی ہوتا رہا ہے۔

اس نظم کا عنوان اور پھر نظم میں موجود بعض الفاظ اور تلمیحات اس کو مذہب اسلام ،اسلامی تہذیب اور پھر اسلامی بیانیے سے جوڑ دیتی ہیں۔عنوان کے لیے تو قرآن کے الفاظ من وعن لے لیے گئے ہیں۔اس میں منصور کے نعرے 'اناالحق' کا ذکر بھی بطور تلمیح آ گیا ہے۔یہ نعرہ بھی بنیادی طور پر کسی غیر مسلم مذہب کے مخالف نہیں ہے، بلکہ اُس وقت جب یہ نعرہ حسین بن منصور حلاج کی زبان سے ادا ہوا تھا ، اسے اسلامی توحید کے خلاف ہی سمجھا گیا تھا، بعد میں سیاست بھی اس کے خلاف ہوگئی اور منصور کو دار پر کھینچا گیا۔اور پھر مزید بعد کے زمانوں میں یہ نعرہ سیاست گردی کے خلاف اور غلامی کے خلاف 'انقلاب زندہ باد' جیسا نعرہ بن گیا۔اور فیض کی نظم میں اس نعرے کی گھن گرج نعرۂ انقلاب کی گھن گرج کے ہم معنیٰ ہی ہے۔اب اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا کہ فیض اس نعرے سے فی الواقع کیا معنیٰ سمجھتے تھے، وہ بھلے ہی منصور کو درست مانتے ہوں اور اپنے من میں 'انا الحق' کی کوئی توجیہ کرتے ہوں جیسے کہ بہت سے صوفیاء اور علماء نے کی ہے،مگر نظم میں یہ محض عزم واستقلال اور انقلاب کے معنیٰ میں ہی ہے۔اس میں اس عزم کا اظہار ہے کہ منصور حلاج کی طرح ہم بھی خوشی خوشی تختہ دار کو چوم لیں گے مگر اپنے دعوے سے سرمو انحراف نہ کریں گے۔

ایک جملۂ معترضہ کے طور پر یہ بھی سن لیں کہ نعرۂ اناالحق سے کوئی کچھ بھی سمجھے اور جو چاہے معانی نکالے مگر 'اناالحق' فرعون کے نعرے 'انا ربکم الاعلیٰ' سے بہت مختلف ہے۔اس میں غرور اور خدائی کا دعویٰ ہے جبکہ 'اناالحق' میں عاجزی اور فنا کا تصور ہے۔دونوں قلبی واردات کی سطح پر ایک دوسرے کے متضاد ہیں، ایسے ہی جیسے کفر اور ایمان ایک دوسرے کے کھلے متضاد ہیں۔

جس طرح کوئی فلم، ناول یا افسانہ وغیرہ جس کی زمین مذہبی علامتوں پر استوار ہو، یا اس کی کہانی مندر، مسجد، گردوارہ یا چرچ وغیرہ کے ارد گرد گھومتی ہو تو محض اس بات سے وہ افسانہ، ناول یا فلم مذہبی نہیں ہوجاتی، اسی طرح کوئی نظم، فن پارہ یا ادب مذہبی علامتوں کی وجہ سے مذہبی نہیں ہوجاتا۔انہیں اگر کوئی چیز مذہبی بناتی ہے تو وہ لفظوں ، استعاروں اور تلمیحات کا برتاوا ہے کہ ان میں معنیٰ کو کس کیف ونوع کے ساتھ برتا گیا ہے۔اگر کسی نے یہ بات نہیں جانی تو اس نے آرٹ اور ادب کو نہیں جانا۔

اس نظم کو یا اس کی کسی لائن کو ہندو مخالف بتانا شعر وادب سے سراسر ناآشنائی والی بات ہے یا پھر یہ کہ سیاست چلانا مقصود ہے اور کچھ نہیں، کوئی بھی ادب وساہتیہ کا آدمی اس نظم کو ہندو مخالف نہیں کہہ سکتا۔اور جبکہ یہ معلوم ہے کہ یہ نظم خود پڑوسی ملک کے حکمراں جنرل ضیاء الحق کی بعض پالیسیوں کے خلاف کہی گئی تھی ،تب تو اور بھی کوئی تُک نہیں بنتی کہ اسے ہندو مخالف بتایا جائے۔

تعجب ہے کہ پڑوسی ملک پاکستان میں جس شاعر کو ہندوستان نواز کہا گیا، آج اسی کے چند بول ہندو مخالف قرار دئے جارہے ہیں۔اس نظم سے ایک زمانے میں پاکستان کی حکومت خوف کھاتی تھی اور آج ہندوستان کی حکومت کو اسی نظم سے ڈر ستا رہا ہے۔سیاسی اکھاڑوں کے پہلوان بھی کتنے بہادر ہوتے ہیں، کہ لفظ وصوت کی گھن گرج سے ڈر جاتے ہیں، حالانکہ ان کے اپنے پاس توپوں، میزائیلوں اور ٹینکوں کی گڑگڑاہٹ ہوتی ہے اور پھر بھی وہ کمزور اور سریلی آوازوں سے خوف کھاتے ہیں۔کیا یہ اپنے آپ کچھ کم تعجب خیز بات ہے۔

☆☆☆

❑ملکی صورتِ حال

بھارتی سماج کے مظلوم ومحروم طبقے کا متحدہ محاذ
وقت کی اہم ضرورت

احمد نور عینی

ہمارا یہ دیش دنیا کا قدیم آبادی والا دیش ہے..... کتنے ہی کارواں آئے اور یہاں پڑاؤ ڈالا اور کتنی ہی قومیں آئیں اور انھوں بھارت کو اپنا مسکن بنایا..... آنے والوں میں ایک طبقہ ایسا بھی آیا جس نے اس ملک کے سماج کو عزت کی بلندیوں سے ذلت کی پستیوں میں ڈال دیا..... یہ طبقہ برہمن کے نام سے جانا جاتا ہے .....تاریخی حقائق بتاتے ہیں کہ یہ طبقہ 1500 قبل مسیح میں بھارت آیا..... برہمن طبقہ جب بھارت آیا تو اس نے بھارتیہ سماج کو چار حصوں میں تقسیم کیا:

(۱) برہمن (۲) چھتری (۳) ویش (۴) شودر

(بھارتی سماج میں ان میں سے ہر ایک کا کتنا حصہ ہے وہ تحریر کے ساتھ ارسال کردہ تصویر میں ہے۔)

شودر کو بنیادی طور پر تین حصوں میں تقسیم کیا گیا..... بیک ورڈ' ایس سی' ایس ٹی..... پھر بیک ورڈ کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا..... اپر بیک ورڈ , ادر بیک ورڈ (او بی سی) موسٹ بیک ورڈ.....

ایس سی ایس ٹی او بی سی ہے کیا؟

ایس سی: شیڈولڈ کاسٹس

او بی سی: ادر بیک ورڈ کاسٹس

اردو میں یوں ترجمہ کیا جاتا ہے:

ایس سی: درج فہرست ذاتیں

ایس ٹی: درج فہرست قبائل

او بی سی: دیگر پچھڑی ذاتیں

ایس سی ایس ٹی کا نام دستوری ہے.....یعنی یہ نام ان لوگوں کو دستور میں دیا گیا ہے.....ہم جنھیں دلت کہتے ہیں وہ یہی طبقہ ہے مگر یہ لوگ دلت لفظ کو پسند نہیں کرتے اس لیے انھیں ایس سی ایس ٹی یا بہوجن کے نام سے ذکر کرنا چاہیے.....(بہوجن کی وضاحت آگے آئے گی).....دھرم شاستروں میں ان کو جو نام دیے گئے ان سب میں ذلت وحقارت کا مفہوم پایا جاتا ہے اس لیے یہ لوگ اپنے لیے ایس سی ایس ٹی کا لفظ استعمال کرتے ہیں.....

برہمنوں نے شودروں کو 6500 ذاتوں میں تقسیم کیا.....پھر ذیلی ذاتیں بنا کر انھیں تقریبا 78000 ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا..... پھر اسی پر بس نہیں کیا بل کہ شودر کی ان ذاتوں اور ذیلی ذاتوں میں فاضل مفضول کی نفسیات پیدا کیں..... ہر فاضل اپنے مفضول کو حقیر سمجھتا ہے اور ہر مفضول اپنے سے فاضل سے حسد کرتا ہے..... یہ سب شودروں کے درمیان ہوتا ہے..... برہمن انھیں آپس میں لڑا کر اپنا الو سیدھا کرتا ہے.....

برہمن یہاں 1500 قبل مسیح میں آئے.....اس وقت سے انھوں نے بھارت سماج کو اپنا غلام بنا کر رکھا ہوا ہے.....چھتری اور ویش کو بہ ظاہر باعزت طبقہ باور کرایا جاتا ہے مگر حقیقت میں ان کا کام بھی برہمن کی خدمت کرنا ہے..... برہمنیت کے خلاف تاریخ میں کئی تحریکیں اٹھیں جن میں گوتم بدھ کی تحریک کو نمایاں مقام حاصل ہے.....گوتم بدھ نے غیر برہمنوں کو بہوجن کا نام دیا جس کا ترجمہ

سنسکرت میں اکثریت ہے..... آج بھی بہوجن کا لفظ غیر برہمن طبقے اور خاص کر ایس سی ایس ٹی کے لیا استعمال کیا جاتا ہے.....

برہمن مسلمانوں کے خلاف بھارتی سماج کو بھڑکانے کے لیے کہتے ہیں کہ یہ لوگ باہری ہیں..... آیئے دیکھتے ہیں کہ باہری کون ہے..... ڈی این اے کے ذریعہ کی جانے والی تحقیق سے یہ بات ثابت ہوچکی ہے کہ برہمن اس دیش کے اصلی باشندے نہیں ہے..... یہ تحقیق ٹائمس آف انڈیا نے 21 مئی 2001 کو اپنے اخبار میں شائع کی تھی (یہ رپورٹ اس تحریر کے ساتھ موجود ہے) باہر سے آنے والے برہمنوں نے مسلمانوں کے خلاف باہر سے آنے کا اتنا بڑا ہنگامہ مچایا کہ غیر مسلم طبقے کی بڑی تعداد ان سے متاثر ہوگئی..... حالاں کہ مسلمان باہر سے نہیں آئے..... مسلمان نسلی اور سماجی تقسیم میں شودر طبقے سے تعلق رکھتے ہیں..... برہمن نے بڑی چالاکی سے یہ کھیل کھیلا کہ سماجی تقسیم میں مسلمانوں کو اقلیت میں کرنے کے لیے مذہب کا کھیل کھیلا..... اور مسلمان بھی بے شعوری ہے میں ان کے اس جال میں پھنستے گئے.....

برہمن نے بڑی چالاکی سے ایک کام اور کیا کہ انھوں نے اپنے مذہب اور اپنے لٹریچر کو پورے بھارتی سماج کا مذہب اور لٹریچر باور کرایا..... ہم نے بھی اسی کو حقیقت سمجھا..... ہم جس مذہب اور جس لٹریچر کو بھارتی سماج کا مذہب ولٹریچر سمجھتے ہیں وہ دراصل برہمن کا مذہب ولٹریچر ہے..... گیتا اس مذہب کا فلسفہ ہے اور منوسمرتی اس کا قانون ہے..... ایک زمانے سے یہ لوگ منوسمرتی کو باضابطہ نافذ کرنے کے لیے کوشاں ہیں..... جزوی اور غیر رسمی طور پر تو منوسمرتی سماج کے رگ وپے میں سرایت کر چکی ہے..... اب ان کی کوشش ہے کلی وسرکاری طور پر اسے لاگو کردیں..... سی اے اے اور این آر سی کے پیچھے یہی آئیڈیالوجی کام کر رہی ہے.....

برہمن کے اندر نسلی عصبیت حد درجہ پائی جاتی ہے..... ان کے بنیادی طور پر آٹھ خاندان پائے جاتے ہیں..... کسی دوسری نسل کو یہ لوگ برہمن میں داخل نہیں کرتے ہیں..... اس لیے برہمن اس ملک میں ہمیشہ اقلیت میں رہے ہیں..... آج بھی برہمن اس ملک میں صرف ساڑے تین فی صد ہیں..... یہ اس ملک کی عجیب حقیقت ہے کہ اس ملک کی سب سے بڑی اقلیت برہمن ہیں اور مسلمان اس ملک کی سب سے بڑی اکثریت ہے..... برہمنوں نے خود کو اکثریت میں ثابت کرنے کے لیے اس ملک کے ایس سی ایس ٹی او بی سی اور چھتری شودر سب کو ہندو لفظ کے ذریعہ متحد کر دیا گیا..... اور نعرہ دیا گیا کہ گرو سے کہو ہم ہندو ہیں..... حالاں کہ اس ملک کے سماج کے لیے ہندو کا لفظ کسی بھی دھرم شاستر میں نہیں ملتا..... مگر ہم مسلمان بھی برہمن کی اس سازش کو سمجھ نہیں پائے اور برہمن کی طرف سے بنائے گئے سماج کے چاروں طبقات کو ہندو سمجھنے اور کہنے لگے ہمیں ایک بات بہت اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ برہمن جس قانون اور دستور کو مانتے ہیں وہ منوسمرتی ہے..... منوسمرتی کی بنیاد جس تقسیم پر ہے وہ سماجی تقسیم ہے نہ کہ مذہبی..... ہندو مسلم کی مذہبی تقسیم کو ان لوگوں نے اپنے گھٹیا مقاصد حاصل کرنے کے لیے عام کی ہے..... ہم نے اسی تقسیم کو اصل سمجھا یہ ہماری بہت بڑی غلطی رہی ہے.....

برہمن چوں کہ صرف ساڑھے تین فی صد ہیں انھیں اپنا کام کرنے کے لیے افرادی وسائل چاہئیں اس لیے انھوں نے شودروں کی دو بنیادی تقسیم کی: چھوت اور اچھوت..... اچھوت میں ایس سی اس ٹی آتے ہیں..... اور اچھوت کا مطلب ان کے یہاں نجس العین کے ہیں..... چھوت میں ان لوگوں نے او بی سی کو رکھا ہے..... یعنی یہ لوگ رہیں گے تو شودر ہی لیکن نجس العین نہیں ہوں گے..... برہمن طبقہ شودروں کے اس چھوت طبقہ کے چہروں کو اپنے کام کے لیے استعمال کرتے ہیں..... یعنی دماغ برہمن کا ہوتا ہے مگر سامنے چہرہ ان چھوت شودروں کا ہوتا ہے..... اور اب تو مصلحتاً اچھوت چہروں کا استعمال بھی شروع کر دیا ہے..... او بی سی اس سماج میں 52 فی صد ہیں..... انھیں 52 فی صد تحفظات ملنے چاہیے تھے..... مگر برہمنوں نے انھی ستائیس فی صد تحفظات دیے جو گھٹ کر 4 فیصد ہوگئے..... اور زمینی وتطبیقی سطح پر چار فی صد بھی نہیں رہے.....

سماج کی اس غیر منصفانہ تقسیم کو ختم کرنا اور محروموں و مظلوموں کا ایک محاذ بنانا اس قوم کا کام ہے جو دنیا سے ناانصافی ختم کرنے کے لیے مبعوث کی گئی ہے..... کیا ہم اس کے لیے تیار ہیں؟

☆☆☆

❑ملکی صورتِ حال

آج کیوں سینے ہمارے شرر آباد نہیں؟؟

عبدالرشید طلحہ نعمانی

استخلاصِ وطن کی خون آشام تحریک میں جن قلم کاروں اور شاعروں نے اپنی سحر انگیز صحافت اور ولولہ خیز شاعرانہ تخیل کے ذریعہ مجاہدین کے شانہ بہ شانہ کھڑے ہوکر شمعِ حریت کو فروزاں رکھا، ان میں جوش ملیح آبادی کا نام سرفہرست ہے۔ جوش نے اپنی بلند پایہ شاعری کے ذریعہ خوابیدہ ضمیر کو بیدار کرنے اور پژمردہ قلوب کو جھنجھوڑنے کا وہ انقلاب آفریں کارنامہ انجام دیا کہ ''شاعرِ انقلاب'' ان کے نام کا جزو لاینفک بن گیا۔

اُن حالات کے پس منظر میں اُن کا یہ شعر غیر معمولی مقبول ہوا اور مسلسل زباں زدِ خاص و عام رہا۔

کام ہے میرا تغیر نام ہے میرا شباب
میرا نعرہ، انقلاب و انقلاب وانقلاب

موجودہ حالات میں بھی حکومت کی پیہم ریشہ دوانیوں اور دسیسہ کاریوں کے خلاف انقلاب کے علم برداروں نے اسی شعر کو اپنی سوچ وفکر کا محور بنایا اور احتجاج کو انقلاب کا پیش خیمہ بتاتے ہوئے اس پرخطر راہ میں تن من دھن کی بازی لگادی اور دنیائے احتجاج میں ایک نئی تاریخ رقم کرڈالی۔ یہ میرا ملی اور اخلاقی فریضہ ہے کہ میں سب سے پہلے ان تمام طلبہ اور طالبات کو بہ صمیم قلب مبارک باد پیش کروں جنہوں نے پوری جرئت مندی و جفاکشی کے ساتھ اس تحریک کا نہ صرف آغاز کیا؛ بلکہ خونِ جگر سے اسے تاہنوز تر وتازہ رکھا۔ سر پر کفن باندھے جذبۂ شہادت سے سرشار جامعہ کے نوجوانوں کو سلام، پولس سے برسرِ پیکار ناز ونعم میں پلی قوم وملت کی بیٹیوں کو سلام، ملک کے طول وعرض میں آئین کی حفاظت کے لیے نکلنے والے انسانی سروں کے سمندر کو سلام، خرد کو غلامی سے آزاد کرنے والی ہر تحریک کو سلام، تیر کے مقابلے میں جگر آزمانے والی ہر تنظیم کو سلام، ستم گر کو گل دستۂ محبت پیش کرنے والی ہر خاتون کو سلام، لاقانونیت کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے والے ہر فرد کو سلام۔

آج ضرورت ہے احتجاج کے ذریعہ اپنے جائز حقوق کو وصول کرنے کی، ملکی سالمیت کو درپیش خطرات سے بچانے کی اور وطن عزیز کو ایک بار پھر آزادی دلانے کی۔ مگر کیا کیا جائے کہ سادہ لوحی کی بھی انتہا ہے۔ ہم سے پوچھا جارہا ہے کہ احتجاج کس بات پر؟ دلاسے دیے جارہے ہیں کہ آپ کو ملک بدر نہیں کیا جائے گا؟ طرح طرح سے باور کرایا جارہا ہے کہ کسی کی شہریت نہیں چھینی جائے گی؛ لیکن میں بتادوں کہ ہم یہ نوبت آنے ہی نہیں دیں گے! ہم احتجاج کرینگے اور پوری قوت کے ساتھ احتجاج کریں گے! شہریت ترمیمی بل کے خلاف۔۔ این آر سی کے نفاذ کے خلاف۔۔ ظلم کے بڑھتے سیل رواں کے خلاف۔۔ دستور میں جبراً تحریف کے خلاف۔۔ دہلی کے جنتر منتر پر، بنگال کے کوچے کوچے میں، دیوبند ولکھنو سے بنگلورو کیرلا تک، بند کمروں سے لے کر شاہ راہ عام تک، جامعہ ملیہ وعلیگڑھ سے جامعہ عثمانیہ اور مولانا آزاد تک۔ احتجاج ہمارا جمہوری حق ہے اور ہم ظلم وستم ظریفی کے خلاف اسحق کا بھرپور استعمال کریں گے۔

احتجاج کی اس عمومی اور انقلاب آفریں فضا کے باوجود کچھ ریاستیں، کچھ شہر اور کچھ اضلاع وہ ہیں جہاں اب تک پراثر احتجاج کا بگل نہیں بجایا گیا، اس کی معقول یا غیر معقول جو بھی وجہ ہو؛ مگر ان پر آشوب حالات کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شمشیر بکف دشمن کے مقابلے کے لیے ہوش مند قیادت کے بدلے سر بکف سیادت کی ضرورت ہے جو خرد کی گتھیاں سلجھانے کے بجائے جنون وعزم کی ہم رکاب ہو اور تیر آزمانے والے ستم گروں کا جواب جگر آزما کر دے سکے۔ اب تک زبانی ڈھکوسلے اور پدرم سلطان بود کے نعرے بہت ہو گئے، مصلحت کی دبیز چادریں اتار پھینکیے، سیاسی مفادات کو پس پشت ڈالیے، کریڈٹ حاصل کرنے کی منافقت چھوڑ دیجیے، تعصب واختلاف کی قبائیں تار تار کیجیے، جرائم کا پٹارہ کھلنے اور دنیا کے آگے شرم سار ہونے کا خوف مت کیجیے، اب دماغ کی نہیں دل کی صدائے بازگشت پر لبیک کہیے! نمرود وقت کی شعلہ زن آگ میں بے خوف وخطر کود پڑیے، آواز سے آواز اور قدم سے قدم ملا کر آگے بڑھیے! اور بہ بانگ دہل یہ اعلان کر دیجیے

ہم زمیں کو تری ناپاک نہ ہونے دیں گے
تیرے دامن کو کبھی چاک نہ ہونے دیں گے
تجھ کو جیتے ہیں تو غم ناک نہ ہونے دیں گے
ایسی اکسیر کو یوں خاک نہ ہونے دیں گے
جی میں ٹھانی ہے یہی جی سے گزر جائیں گے
کم سے کم وعدہ یہ کرتے ہیں کہ مر جائیں گے

اب مشورے بہت ہو چکے، غور وفکر بہت ہو چکا، یہ رائے عامہ ہموار کرنے کا وقت نہیں، کچھ کر گزرنے کا وقت ہے۔ احتجاج کے لیے اجازت طلب کرنے کا وقت نہیں، بے جگری کے ساتھ دشمن سے مقابلے کا وقت ہے۔ آیئے! ہم اپنے شہر کے مردہ حتجاج میں اک نئی روح پھونکیں، خواب خرگوش میں مست عوام کو بیدار کریں، ایک بار پھر تازہ دم ہو کر میدان عمل میں کود پڑیں۔ یہ کس درجہ خوش آیند بات ہے کہ پندرہ یوم کے مسلسل احتجاج سے برسر اقتدار جماعت اقدام کے بلند بام سے دفاع کے پائیدان پر آ چکی ہے۔ جلسے جلوسوں، اخباری اشتہاروں، ٹی وی پروگراموں اور پریس کانفرنسوں کے ذریعہ شہریت ترمیمی قانون اور مردم شماری رجسٹریشن کے حوالے سے مرکزی وزراء کی بیان بازیوں؛ بل کہ گمراہیوں کا سلسلہ عروج پر ہے۔ وزیر اعظم اور وزیر داخلہ اپنے متضاد بیانات کے ذریعہ میڈیا میں مستقل بحث کا موضوع بنے ہوئے ہیں۔ ''ہندوستان کے دیش واسیوں'' سے لے کر ''مسلم بھائیو بہنوں!'' تک کا طویل سفر بی جے کے لیے بہت دشوار اور کٹھن ثابت ہوا ہے۔

لہٰذا ان امید افزا حالات میں ہم اپنے جذبات کو ہرگز سرد نہ ہونے دیں! پوری قوت وتوانائی کے ساتھ، پورے جوش وولولے کے ساتھ اور بھرپور نظم وضبط کے ساتھ ادنی تساہل کے بغیر اپنا احتجاج درج کرواتے رہیں! اگر ہم کوتاہ دستی سے کام لیں گے یا گرم جوشی کے بجائے سرد مہری دکھائیں گے تو اب تک کا کیا دھرا اکارت وبیکار جائے گا اور ہماری مثال اس جلد باز خرگوش کی ہوگی جو ذرا سی کامیابی پر مطمئن ہو کر بیٹھ جائے اور جسے انجام کار ناکامی کا منہ دیکھنا پڑے۔

یہاں ایک عاجزانہ درخواست معاصر اہل قلم اور جذباتی صحافیوں سے یہ ہیکہ ہم کام کے سلسلہ میں ایک دوسرے کا موازنہ کرنے، قیادتوں کے عدم تعاون کا رونا رونے اور بعض اکابر کی خاموشی اور کھل کر میدان میں نہ آنے کا شکوہ کرنیکے بجائے حسب استطاعت جو بن پڑا کرتے رہیں؛ اسلئے کہ یہ وقت تنقید وتنقیص کا نہیں ہے؛ بلکہ یکجٹ ومتحد ہو کر کام کرنے کا ہے۔ اخیر میں ڈاکٹر کلیم عاجز مرحوم کے ان معنی آفریں اشعار کے ساتھ اپنی بات ختم کرتا ہوں ؎

یہ سمندر ہے کنارے ہی کنارے جاؤ
عشق ہر شخص کے بس کا نہیں، پیارے جاؤ
یوں تو مقتل میں تماشائی بہت آتے ہیں
آؤ! اس وقت کہ جس وقت پکارے جاؤ

☆☆☆

❑ ملکی صورتِ حال

متنازعہ شہریت قانون واپس لینے تک احتجاج برقرار رہے گا

مشترکہ مزاحمت کو آگے بڑھانے کے لیے ہمہ جہت و ہمہ پہلو حکمت عملی پر کام جاری

معین دین خالد

متنازعہ شہریت قانون کے نتیجے میں بھارت میں ناگفتہ بہ کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔ بعض حلقوں کی جانب سے اسے دوسری جنگ آزادی تک کا نام دیا گیا ہے۔ بھارت میں جماعت اسلامی ہند سب سے منظّم اور قدیم ترین جماعت ہے، جس کی رائے اور اقدامات کو عوام وخواص اور حکومتیں بھی جاننا چاہتی ہیں۔ جماعت کے نائب امیر انجینئر امین الحسن نے حیدرآباد آمد کے موقع پر ہفت روزہ دعوت کے دفتر میں خصوصی بات چیت میں ملکی، ملی، تحریکی سیاسی اور نظریاتی پہلوؤں کے علاوہ میڈیا کے منظرنامے پر کھل کر اظہار خیال کیا۔

حکومت کا گمان

دفعہ ۳۷۰، بابری مسجد پر عدالتی فیصلہ اور تین طلاق کے قانون پر جس طرح ملک کے شہریوں نے خاموشی اختیار کی تھی، اس بنا پر ملک کے حکمرانوں کو یہ گمان ہو چلا تھا کہ عوام اس متنازعہ قانون پر بھی زبان بند رکھیں گے اور مسلمان اتنے مرعوب کر دیے گئے تھے کہ ان کی نظر میں وہ آواز اٹھانے کے قابل ہی نہیں رہ گئے تھے۔ اس کے برعکس عوام شہریت قانون کی مخالفت کے لیے از خود سڑکوں پر اتر آئے اور بلا کسی تفریق کے کندھے سے کندھا اور آواز میں آواز ملا کر سب نے حکومت کے اس عمل اور اس کے پس پردہ ان کی نیت کو نشانے پر لیا۔ جناب امین الحسن کی رائے میں یہ عمل ''آرگانیک'' ہے، جس میں کسی قیادت کا کوئی رول نہیں ہے۔ پچھلے پانچ برسوں کے دوران لوگوں کے جذبات کو بری طرح دبا کر رکھا گیا تھا اور اس موقع پر ایک لحاظ سے ان ہی جذبات کا اُبال سڑکوں پر نکل پڑا۔

متنازعہ سی اے اے (شہریت ترمیمی قانون) پاس ہوا تو سب سے پہلے اسی شام علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے طلبا نے ایک مکتوب جاری کیا جس میں انھوں نے اساتذہ اور دیگر ذمہ داروں سے اس قانون کا بائیکاٹ کرنے کی اپیل کی تھی، لیکن یوپی کی حکومت نے علی گڑھ کے احتجاج کو زیادہ ابھرنے نہیں دیا اور اسے سختی کے ساتھ کچلنے کی کوشش کی، جب کہ دہلی میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے طلبا سخت جان ثابت ہوئے اور متنازعہ قانون کے خلاف احتجاج میں ڈٹے رہے۔ بعد کے مرحلے میں دہلی پولیس نے جامعہ کیمپس میں گھس کر جو بربریت کی اس نے ان طلبا کے حق میں ملک اور پوری دنیا کو حمایت کے لیے لا کھڑا کر دیا۔

ثابت قدم طالبات و خواتین

جامعہ ملیہ اسلامیہ میں پولیس ایکشن کے نتیجے میں دو تین لڑکیاں پوسٹر گرل کے طور پر ابھر کر آ گئی تھیں اسی طرح

دہلی میں اس صدی کی ریکارڈ سردی کے باوجود تین ہفتوں سے لگاتار دھرنے پر بیٹھے دو ہزار مرد وخواتین نے شاہین باغ کو احتجاج کی ایک اور علامت بنادیا۔ اس پوری مہم کی خصوصیت کو بیان کرنے کے لیے کہا گیا تو نائب امیر جماعت اسلامی ہند نے بتایا کہ اس تحریک مزاحمت کی نمایاں خصوصیت یہ رہی کہ یہاں سیاست دانوں کو کوئی قدم رکھنے نہیں دیا گیا اور پوری طرح عوام نے خود اپنے ہاتھوں اس کی کمان سنبھالی ہے۔

جامعہ کے پورے معاملے میں لڑکیوں کا کردار بہت اہم اور نمایاں رہا۔ جامعہ کے علاوہ جنتر منتر اور منڈی بازار وغیرہ مقامات پر منعقد ہورہے احتجاجوں میں اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلم اور غیر مسلم لڑکیاں نمایاں طور پر متنازعہ شہریت قانون کی مخالفت میں کھڑی دیکھی گئیں۔

جناب امین الحسن کا کہنا ہے کہ عام رجحان، کہ اسلام میں عورتوں کو آزاد نہیں اور انھیں دبا کر رکھا جاتا ہے اس دوران غلط ثابت ہوا۔ احتجاج میں عورتیں بھی برابر شریک رہیں۔

مزاحمت بنا سرپرستی

موجودہ عوامی تحریک کا قیادت اور مرکزیت سے عاری ہونا کیا ملک اور قوم کی قیادت پر عدم اعتماد ہے یا یہ عوامی تحریک ایک مثبت عمل ہے؟ اس اندیشے پر نائب امیر جماعت نے کہا کہ سڑک پر اتر کر عوام نے از خود ایک فطری اور فوری (Spontaneous) ردعمل ظاہر کیا ہے۔ پوری عوامی مہم پر کنٹرول کر کے اس کو ایک رخ وسمت دینے کی ضرورت کے بارے میں ان کا کہنا تھا کہ ''سماجیات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ دنیا کے بڑے تاریخی بدلاؤ میں طلبا کا ہمیشہ بڑا رول رہا ہے۔ لیکن یہ احتجاج 'الناس' یعنی پبلک کی جانب سے کھڑا کیا گیا ہے، جس میں واقعات اور حالات پر ایک فطری ردعمل ظاہر ہوتا ہے''۔ اس کی قیادت نہیں کرنا چاہیے۔ اگر کوئی قیادت اس کو کنٹرول کرے گی تو اس پر لیبل لگ جائے گا اور اسے کچھ الگ رخ دیا جاسکتا ہے البتہ الائنس اور مشترکہ محاذ کے ذریعے کچھ بنیادی رہنما خطوط پیش کیے جاسکتے ہیں'' اس بارے میں انھوں نے بتایا کہ:

☆ اس مہم کو فرقہ وارانہ ہونے سے بچایا جائے گا تاکہ یوں ہو کہ ہندوستانی عوام بمقابلہ ہندوتوادی ٹولہ۔

☆ غیر متشدد مہم یعنی جذباتیت اور جان ومال کو نقصان پہنچانے سے بچنا۔

☆ منظّم یعنی کسی قوم کے خلاف یا جذباتیت لیے ہوئے نہ ہو۔ کہیں خدانا خواستہ کالی بھیڑیں داخل ہوکر مہم کو منتشر نہ کردیں۔

متنازعہ شہری قانون کو واپس لینے تک احتجاج کو جاری وساری رکھا جائے گا۔

بنیاد پرستی کی بحث

کیرالا کے اسلام پسند نوجوانوں کی جانب ''لا الہ الا اللہ'' کے نعرے والا ایک ویڈیو وائرل ہونے پر یہ بحث چل پڑی تھی کہ اس طرح بادی النظر میں اسلامی نعروں کو عوامی احتجاجوں میں بلند کرنے پر کہیں غیر مسلم ہمدرد بدک نہ جائیں، تو اس پر جناب امین الحسن نے یہ وضاحت کی کہ کسی نعرے کسی قوم کے خلاف نہیں ہونے چاہئیں مثلاً ''قبر کھودیں گے'' جیسے نعرے لگانے سے بچنا چاہیے۔ البتہ اس مرتبہ اصل حملہ چوں کہ مسلم شناخت پر ہی ہے تو ایسے میں کچھ نعرے ایسے استعمال میں آجاتے ہیں جن سے عوام میں جوش وجذبہ بھر جاتا ہے جیسے کہ ''جئے بھیم''، ''انقلاب زندہ باد'' وغیرہ اسی ضمن میں ''لا الہ الا اللہ'' کو بھی رکھا جاسکتا ہے۔ جس سے ہر عام وخاص مسلمان کو تحریک ملتی ہے۔ کانگریسی دانشور ششی تھرور کی جانب سے

پیش کیے گئے اس اندیشے کے بارے میں کہ کہیں مسلم بنیاد پرست پوری مہم کو اسلامی نعروں کے ذریعے ہائی جیک نہ کرلیں پوچھا گیا تو جناب امین الحسن نے کہا کہ اج بھی بھارت میں بالعموم تمام اقوام کندھے سے کندھا ملا کر کام کر رہی ہیں معدودے چند ہیں جن کو اس پر کچھ تحفظات ہوسکتے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ ''میں شاہین باغ سمیت متعدد احتجاجوں میں بہ نفس نفیس موجود رہا برہمنوں، سرداروں، امبیڈکر وادیوں سب کے سامنے ہم نے ''بسم اللہ'' کہہ کر اپنی بات شروع کی، کسی نے جے بھیم، جے ہند کہہ کر شروع کیا جس پر کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہوا۔ اصل موضوع سی اے اے سے ہونے والے نقصانات پر سب کو متحد و مرکوز رکھنا ہے''۔

''آئیڈیا آف انڈیا'' کو لے کر بحث چل پڑی ہے اور اس احتجاج کی مناسبت سے کیا ہندوتوا وادا اور اشتراکیت کے مقابلے میں دین کو ایک متبادل نظام ونظریے کے طور پر اہل ملک کے سامنے پیش کرنے کا یہ موقع ہے یا نہیں؟ اس پر کہا کہ وقتاً فوقتاً ہم اس موضوع پر بات کرتے آئے ہیں اور مسلمان تو کبھی فرقہ پرست نہیں رہے۔ اگر یہاں کی اقوام کے ساتھ مسلمانوں نے تعصب برتا ہوتا تو ہمارا ملک آج جیسا ہے ویسا دکھائی نہ دیتا۔ اس سے آگے بڑھ کر مسلمانوں نے بھارت کی صورت گری کی ہے یہاں تک کہ بھارت میں مسلمانوں کی حکومتیں بالعموم آئیڈیل رہی ہیں۔

منصوبہ، حملہ اور ڈر

جواہر لال نہرو یونیورسٹی میں نقاب پوشوں کے ذریعے یونیورسٹی طلبا اور طالبات پر قاتلانہ حملے کے نتیجے میں کوئی ڈر، خوف یا مایوسی در نہیں آئی ہے بلکہ ایک نیا جوش اور جذبہ طلبا برادری میں امڈ آیا۔ اس طرح دلوں میں ڈر پیدا کرنے کے مقصد سے کی گئی ایک دہشت گردانہ کارروائی انجام دینے کے باوجود طلباء کے دلوں سے ڈر ہی نکل گیا۔ جے این یو میں نقاب پوشوں کے حملے کے پیچھے شہریت قانون اور این آر سی کے موضوع سے ملک کی توجہ کو ہٹانے کی کوئی سازش تو نہیں؟ اس پر جناب امین الحسن نے وضاحت کی کہ پہلے دور کی مودی حکومت نے ملک کے سیاسی منظر نامے سے حزب اختلاف کو ختم ہی کر دیا تھا۔ تمام جمہوری اداروں پر زعفرانی رنگ چھڑک دیا گیا تھا۔ این جی اوز کے ہاتھ پاؤں جکڑ دیے گئے تھے اور حکمراں جماعت اچھی طرح جانتی ہے کہ جو بھی مزاحمت ہوگی وہ تعلیمی اداروں سے نکل کر آئے گی لہٰذا اپنے اقتدار کے اس دوسرے دور میں ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت اے ایم یو، جے این یو، جیوتی نیواس بنگلورو، یعنی شمال سے جنوب تک مختلف تعلیمی اداروں پر نکیل کسنے کا کام کیا جارہا ہے۔ دنیا اور ملک میں بہترین باغ اور دانشور فراہم کرنے والے ادارے کے طور پر جے این یو کی جو شناخت ہے اس سے ہندتوا وادیوں کو بڑی پریشانی ہے۔ قریب ایک صدی قبل ہندتوا وادی لٹریچر میں ہندو راشٹر کے تین دشمن بتائے گئے تھے۔ ایک مسلمان، دوسرا بایاں بازو، تیسرا عیسائی۔ اسی پلان کے تحت فی الحال مسلمانوں کے خلاف قوانین پاس کیے جارہے ہیں۔ اب بایاں بازو زد پر ہے۔ چنانچہ جے این یو پر حملہ اسی لیے کروایا گیا ہے کہ ایک طرف طلبا برادری حکومت کے خلاف آٹھ کھڑی ہوئی ہے تو دوسری طرف بایاں بازو پہلے ہی سے ان کے دشمن رہے ہیں۔ مجمعے طلبا نے کھل کر بتایا کہ ہندتوا وادی نظریے کے حامل طلبا اب کیمپس میں کہنے لگے ہیں کہ آپ نے ۵۰ سال یہاں 'حکومت' کرلی اب ہماری باری ہے۔ جس کے لیے غنڈہ گردی کے راستے تعلیمی اداروں پر قبضہ جمانے کی کوشش ہورہی ہے۔ چنانچہ جے این یو پر غلبہ پانے کے لیے پولیس

اورانتظامیہ کا بے دریغ استعمال کیا گیا۔

جماعت اسلامی ہند کی پالیسی

جماعت اسلامی ہند کا اس دوران پورے معاملے میں جو رول رہا ہے عام طور پر لوگ اس سے واقف نہیں ہو سکے۔ اس پر روشنی ڈالتے ہوئے نائب امیر جماعت نے بتایا کہ ''جماعت اسلامی ہند کی اسٹوڈنٹ ونگ، ایس آئی اور روز اول سے احتجاج میں صف اول میں نہ صرف شریک رہی، بلکہ قیادت کرتی رہی۔ جامعہ میں ہونے والے احتجاج کو منظّم کرنا، انتشار سے بچانا، ادارے کے انتظامیہ سے گفت وشنید کرنا اور جن بچوں کو پولیس لے گی انھیں آزاد کرنے کے سلسلے میں انتظامیہ اور پولیس پر دباؤ ڈالنا، اسپتال میں زخمیوں کو داخل کرنا ان کے مفت علاج کا انتظام کرنا وغیرہ جیسے کام مسلسل کرتی آ رہی ہے۔ آج تک جامعہ کے سامنے جو احتجاج ہو رہا ہے اس کو منظّم کرنے میں ایس آئی او ایک بڑا رول ادا کر رہی ہے۔ فی الحال ہمیں احتجاجوں میں تعاون و شرکت کے ساتھ ساتھ حقوق انسانی کی خلاف ورزیوں پر دستاویزی کاغذات جمع کرنا، پولیس کی زیادتیوں کی قانونی پکڑ کرنا، حکومت، بالخصوص اتر پردیش کی حکومت کے ظلم اور زیادتیوں کے خلاف کام کرنا، میڈیا اور پی آر، عوامی سطح، عدالتی سطح نیز قومی و بین الاقوامی سطح پر بیداری جیسے کئی محاذوں پر کام کرنا ہے۔ مختلف افراد اور جماعتوں کے ساتھ مل کر جماعت اسلامی کے وسیع تر نیٹ ورک کا استعمال کرتے ہوئے ہم ڈیٹا جمع کرنے اور وفود کو بھیجنے، قانونی ٹیموں کے ساتھ کام کرنے پر توجہ مرکوز کیے ہوئے ہیں۔

جماعت کا اپروچ امت کی تمام جماعتوں اور غیر مسلم تنظیموں اور سرکردہ شخصیات کو ساتھ لے کر چلنے کا ہے۔ ہم تقریر وتحریر کے ذریعے احتجاج کرنے والوں کو تعلیم دے رہے ہیں کہ احتجاج کبھی پر تشدد نہ ہو اور ساری کاروائی دین اسلام کے وقار کو بلند کرنے والی ہو۔ طلبا کے علاوہ طالبات کی جی آئی او اور خواتین ونگ نیز دیگر ذیلی ادارے بھی بہترین تال میل کے ساتھ صوبائی، ضلعی اور مقامی سطح تک ہر سرگرمی میں برابر دامے، درمے، قدمے، سخنے شریک ہیں۔ اسی طرح ملک کی دیگر تنظیمیں اپنے اپنے طریقے سے کام میں لگی ہوئی ہیں جو کہ خوش آئند بات ہے۔

جماعت اسلامی ہند سی اے اے، این آر سی کے خلاف بنے الائنس کے بینر تلے غیر مسلموں کے ساتھ احتجاج کر رہی ہے۔ سیاسی وسماجی سطح پر بیداری کے ساتھ ساتھ ۱۰ نکاتی ایکشن پلان پر الائنس کام کر رہا ہے۔ جماعت اسلامی ہند کی مرکزی قیادت اس دوران احتجاجوں میں شرکت وتعاون تو کر رہی ہے لیکن کوئی قائدانہ رول ادا نہیں کر رہی ہے۔ جبکہ صوبائی سطح پر جماعت کی اکائیاں کچھ زیادہ ہی سرگرم ہیں بلکہ بعض حلقوں میں ریلیوں، احتجاجوں، دھرنوں میں رہبر وقائد بن کر نمایاں رول ادا کر رہے ہیں بلکہ گرفتاریاں بھی دے رہے ہیں۔ تو کیا مرکز اور صوبائی حلقوں کے بیچ سی اے اے کے خلاف احتجاج مہم کی پالیسی کے سمجھنے میں سمجھانے میں کوئی جھول پایا جاتا ہے۔ اس اشکال پر نائب امیر جماعت نے وضاحت کی کہ احتجاج منظّم ہونے کا انتظار نہیں کیا جاسکتا۔ بلکہ جہاں موقع ومناسبت ہو تو سب کو ساتھ لے کر اس ملک کے مسئلہ پر متحدہ طور پر کام کرنا پڑتا ہے۔ جناب امین الحسن نے مزید بتایا کہ ہم مسلمانوں کے علاوہ دیگر سماجی وقومی مسائل کو لے کر اپنے ہی فرقہ ومذہب کی بنیاد پر آواز نہیں اٹھاتے بلکہ کسی بھی مذہب سے تعلق رکھنے والوں پر مظالم ہوتے ہیں تو جماعت اس کے خلاف آواز اٹھاتی ہے۔ اس لیے ہم نہ فرقہ پرست ہیں اور نہ پہلے کبھی تھے۔

احتجاج، میڈیا اور تقاضہ

متنازعہ سی اے اے کے پس منظر میں پیدا شدہ حالات کا تذکرہ کرتے ہوئے نائب امیر جماعت نے بتایا کہ پرنٹ میڈیا ملک کے حالات کے دباؤ کے بعد عوامی احتجاجوں کی رپورٹنگ کرنے کو مجبور ہوا۔لیکن سوشل میڈیا نے بڑھ چڑھ کر اس مہم میں کلیدی رول ادا کیا ہے اور دنیا کے سامنے اس حقیقت کو پھیلا دیا کہ متنازعہ شہریت قانون ''آئیڈیا آف انڈیا'' پر ایک ضرب ہے۔ یہاں تک کہ ان حالات میں مختلف سماجوں کے بیچ جو قربت جانے انجانے میں پیدا ہوتی گئی اس کے نتیجے میں ملک میں ہندو مسلم دوری بھی ختم ہوتی جارہی ہے۔

نائب امیر جماعت اسلامی ہند نے تسلیم کیا کہ موجودہ احتجاجی تحریک کے تقاضوں کے تحت میڈیا نے مسلمانوں اور خاص طور پر تحریک اسلامی کے سامنے بہت بڑا ڈیمانڈ پیدا کر دیا ہے اور وقت کا جو تقاضہ ہے اس مانگ کو صرف جماعت اسلامی اکیلے پورا نہیں کرسکتی بلکہ سب انصاف پسند مسلم غیر مسلم شہریوں اور تنظیموں کو ساتھ لے کر ہی کیا جاسکتا ہے۔ جماعت اسلامی ہند کی سوشل میڈیا میں موجودگی کم ہونے کے سوال کے جواب میں انھوں نے کہا کہ سوشل میڈیا پر جماعت اسلامی موجود ہے۔ امیر جماعت اسلامی ہند کا بابری مسجد سے متعلق بیان ۶۰ لاکھ لوگوں نے دیکھا اور سنا۔خود میرا فیس بک پیج ہزاروں کی تعداد میں فالو کیا جاتا ہے۔بعض تقریروں کے پوسٹ تو لاکھوں کی تعداد میں دیکھے جاتے ہیں۔البتہ سوشل میڈیا پر مزید کام کیا جاسکتا ہے۔

حکومت سے مذاکرات

ریاستوں میں سیاسی قیادت اور حکمرانوں کے ساتھ بات چیت ہورہی ہے تو کیا مرکزی حکومت کے ساتھ ڈائیلاگ قائم کرنے پر سوچا جاسکتا ہے اس پر جناب امین الحسن نے دوٹوک انداز میں کہا کہ ''حکومت سے بات کرنے کا یہ صحیح وقت نہیں ہے''۔

موقع وضرت کے مطابق حکمرانوں سے بات چیت کی جاسکتی ہے لیکن فی الحال دعوتی پہلو پر کام چل رہا ہے۔ دعوت کا مطلب اسلام کی تعلیمات عوام وخواص کو سمجھانا۔سارے انسان ایک خدا کی مخلوق ہیں، رحم ہر مذہب کی بنیادی تعلیم ہے۔اخلاقیات پر گفتگو کی جاسکتی ہے، مذہبی رہنماؤں سے جہاں بھی بات چیت ہورہی ہے تو وہاں یہ ظاہر ہورہا ہے کہ وہ بھی ملک کے موجودہ حالات سے نالاں ہیں۔ موجودہ حکومت سے نالاں طبقے کو اپنے اعتماد میں لے کر احتجاج آگے بڑھانے کے بارے میں جناب امین الحسن نے کہا کہ فی الحال ہم سی اے اے کی مخالفت میں مصروف ہیں کیونکہ یہ احتجاج طویل مدت تک جاری رہنے والا ہے پھر جب یہ معاملہ سپریم کورٹ میں فیصل ہوجائے گا تب ہم آگے مذاکرات کی حکمت عملی طے کرسکتے ہیں۔مسلمانوں کو پریشان کرنے کے لیے یکے بعد دیگرے مسلم مخالف فیصلے کیے جارہے ہیں۔حکومت کا انسداد تبدیلی مذہب بل اور پھر جلد بازی میں یونیفارم سیول کوڈ وغیرہ پیش کرنے کا بھی ارادہ تھا لیکن اب وہ فی الفور اس کی کوشش نہیں کریں گے کیونکہ سی اے اے کے خلاف ملک بھر میں احتجاج ہورہا ہے اور جب تک یہ سلسلہ تھم نہیں جائے گا، ۲۰۲۴ کے انتخابات آجائیں گے اور یہی ماحول بنا رہا تو عین ممکن ہے کہ بی جے پی کی حکومت ختم ہوجائے گی۔ان شاءاللہ!

☆☆☆

□ملکی صورتِ حال

تعلیمی اداروں پر نشانہ کیوں؟

زین العابدین ندوی
دارالعلوم امام ربانی، نیرل۔مہاراشٹر

یہ تو ایک بدیہی حقیقت ہے کہ لوہار کو سونے کی نزاکت اور اس کی قیمت کا اندازہ نہیں ہوسکتا کیوں کہ دونوں کی دنیا میں زمین وآسمان کی دوری ہے، یہی معاملہ علم وجہل کا بھی ہے، جس کا جائزہ ملک میں جاری حالات سے بآسانی کیا جا سکتا ہے، آج ملک کی باگ ڈور ان لوگوں کے ہاتھوں میں ہے جن کا اول تعلیم سے کوئی واسطہ نہیں رہا اور اگر رہا بھی تو تعمیر کے بجائے تخریب کو فروغ دینے کے ہی غرض سے رہا، اس کا نتیجہ کہ بھارت کے موجودہ حالات انتہائی تشوشناک اور تکلیف دہ ہوتے جا رہے ہیں، اور آئے دن ایسے واقعات سامنے آرہے ہیں، جس سے ملک تباہی کی طرف بڑھتا جا رہا ہے اور ملک میں بدامنی کی فضا بنتی جارہی ہے، تعلیمی اداروں پر اور تعلیم حاصل کررہے طلباء پر ظلم وہی کرسکتا ہے جسے نہ تو تعلیم کی اہمیت کا اندازہ ہو اور نہ ہی تعلیم گاہوں کی افادیت کا پتہ ہو، اور ایسا کرنے والے وہی لوگ ہیں جنہوں نے اپنی پوری زندگی میں کبھی کوئی تعلیمی ادارہ تک قائم نہیں کیا، پچھلے ایک روز قبل جے این یو میں حکومت وقت کے اشارہ پر پولیس فورس کی نگرانی میں اور آر ایس ایس کے غنڈوں کی مدد سے جس درندگی اور وحشیانہ انداز میں طلباء پر حملہ کیا گیا ہے وہ ایک طرف جہاں حکومت کے خوف وہراس کا پتہ دیتا ہے وہیں دوسری جانب تعلیم دشمنی کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے۔

یاد رہے کہ یہ ان کا کوئی نیا کارنامہ نہیں ہے بلکہ اس سے پہلے بھی جن لوگوں نے ان کے باطل نظریات کے خلاف آواز اٹھایا ان کے ساتھ بھی ان کے پروجوں نے یہی ننگا ناچ کیا تھا، تعلیم پسند بودھسٹوں کے ذریعہ قائم کردہ نالندا یونیوسٹی کو کسی اور نے نہیں انہیں کے آباء واجداد نے برباد کیا تھا اور یونیورسٹی میں آگ لگا دی تھی اور کتابوں کے ساتھ ساتھ انسانوں کو بھی جلا ڈالا تھا، اس لئے ان کے اس ناپاک عمل سے گھبرانے کے بجائے ان کی اور بھی شدت سے مخالفت کی جائے، اور یہ یاد رہے کہ انہیں تعلیم گاہوں سے اٹھنے والی صداوں سے اتنا ہی ڈر لگتا ہے جتنا ایک نہتے انسان کو شیر سے ڈر لگتا ہے، انہیں ڈر ہے ملک کے طلباء سے ملک کی تعلیم گاہوں سے اس

لئے کہ ان کا خاتمہ یہیں سے ہونے والا ہے، یہی وجہ ہے کہ لگا تار تعلیم گاہوں کو نشانہ بنایا جارہا ہے اور طلباء پر جان لیوا حملہ کیا جارہا ہے، جس کا سلسلہ جامعہ ملیہ اسلامیہ سے شروع ہوا اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پہونچا اور اب جے این یو بھی اس سے محفوظ نہ رہ سکا، اس سے یہ بات سمجھنے لینی چاہئے کہ انہیں کسی مذہب سے نہیں صرف دنگے اور فساد سے ہی مطلب ہے، اور اسی فساد کی آڑ میں یہ ملک پر راج کرتے ہوئے چلے آئے، اس لئے تمام بھارت واسیوں کو یہ عہد کرنا ہوگا کہ ہم سب اس آتنک پسند حکومت اور ظلم پسند تحریک آر ایس ایس سے ملک کو پاک کریں گے اور کسی بھی پل حکومت کے مظالم برداشت نہیں کریں گے، ہمیں ایسے مواقع پر گھبرانے کی بالکل ضرورت نہیں کہ تمام محکموں میں ان کے افراد بیٹھے ہوئے ہیں، تمام ملکی معاملہ ان کے ہاتھوں میں ہے، اس لئے ہم کیا کریں، نہیں بالکل نہیں بلکہ ہمیں ہر حال میں یہ یاد رکھنا ہے کہ ہم ایک جمہوری ملک کے رہنے والے ہیں جہاں سب سے بڑی طاقت عوام کو اور ملک کے قانون کو حاصل ہوتی ہے، اس لئے ہمیں ان کے خلاف حق کی لڑائی جاری رکھتے ہوئے، اپنے حقوق لے کر ہی رہنا ہے اور باطل طاقت کو بتا دینا ہے کہ بھارت کے آئین کے ساتھ کھلواڑ کرنے والوں کو ہم جینے نہیں دیں گے، چہ جائیکہ وہ ہم پر حکومت کرے۔

تعجب ہوتا ہے کہ ملک کے وزیر اعظم جی تعلیم کے حوالہ سے گوتم بودھ کا نام لیتے نہیں تھکتے، اور خود گوتم بودھ کی تعلیمات کو دفن کرنے میں ذرا بھی دریغ نہیں کرتے، اور تعلیم گاہوں پر ایسا حملہ کرنے کا اشارہ کرتے ہیں گویا وہاں چوروں اور اچکوں کا ٹولہ رہتا ہو، یہ بات نہیں بھولنا چاہئے کہ کسی بھی ملک اور سماج کا مستقبل وہاں کے طلباء ہوا کرتے ہیں، اور جس ملک میں طلباء پر صرف اس لئے گولیاں برسائی جارہی ہیں کہ وہ قانون کے تحفظ کی بات کرتے ہوئے حق کی لڑائی لڑ رہے ہیں، ہمیں امید یہ خون رائیگاں نہیں جائیں گے، شرط یہ ہے کہ عوام ان معاملات کو سنجیدگی سے لیتے ہوئے طلباء کی حمایت کریں، اس حملہ کا دوسرا مقصد سی اے اے، این آر سی اور این پی آر کے خلاف جاری مظاہروں کے اثرات کو کم کرنا اور لوگوں کی توجہات کو پھیرنا ہے، اور یہی اس حکومت کا حربہ ہے، اس لئے ہمیں پوری ہوشمندی کے ساتھ کالے قانون کے خلاف اپنی آواز کو مزید بلند کرتے ہوئے جمہوریت کی طاقت کا مظاہرہ کرنا ہے، اور یہ بات کسی بھی صورت میں نہیں بھولنا ہے کہ اس حکومت سے پورے ملک کو خسارہ ہونے والا ہے اور برابر ہو رہا ہے، اسلئے ہمیں آر ایس ایس مکت بھارت بنانے کے اس مشن میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہنا ہوگا، کیونکہ ملک سے آر ایس ایس کو ہٹائے بغیر امن وامان نہ صرف یہ کہ مشکل ہے بلکہ ناممکن ہے۔

☆☆☆

❑ شخصیات

پروفیسر ریاض الرحمٰن خاں شروانی، کچھ یادیں کچھ باتیں

(۱۹۲۴ء۔۳ نومبر ۲۰۱۹)

ڈاکٹر فخر عالم

ریسرچ ایسوسی ایٹ، شعبہ عربی، علی گڑھ مسلم یونیورسیٹی

پروفیسر ریاض الرحمٰن خاں شروانی مرحوم صاحب سے میری پہلی ملاقات اس وقت ہوئی جب میں ۲۰۰۶ء میں ایم ۔اے کا طالب علم تھا اور پروفیسر مختارالدین احمد صاحب مرحوم (۱۹۲۴ ۔ ۲۰۱۰ء) کے پاس ناظمہ منزل، امیر نشاں میں کچھ علمی گفتگو کے سلسلے میں موجود تھا، دوپہر کا وقت تھا تقریباً ایک بج رہا ہوگا، میں ڈاکٹر صاحب مرحوم کے ڈرائنگ روم میں کچھ پروف پڑھ رہا تھا کہ اچانک دروازے کی گھنٹی بجی، میں دروازہ کھولنے گیا تو ایک عمر دراز، اوسط قد، گورا رنگ، چہرے پر سفید داڑھی، عینک لگائے ہوئے ایک صاحب دروازے پر کھڑے تھے، میری ان سے کوئی شناسائی نہیں تھی بس آرزو صاحب مرحوم سے نام سنتا رہتا تھا، انہوں نے کہا کہ آپ اندر بتادیجئے کہ شروانی صاحب آئے ہیں، میں نے ڈاکٹر صاحب کو بتایا تو وہ فوراً ہی کھڑے ہوگئے اور خود دروازہ کھولنے چلے گئے اور ان کو ڈرائنگ روم میں لاکر بٹھایا، گرمی کا مہینہ تھا غالباً مئی یا جون کا، اس لئے ڈاکٹر صاحب نے روح افزاء کا شربت منگایا اور پھر دونوں میں بلا تکلف مختلف علمی موضوعات اور دوسرے امور پر بھی بات ہونے لگی، دونوں حضرات کی باتوں سے میرے لئے اندازہ لگانا کوئی مشکل نہ تھا کہ دونوں ہی بہت بے تکلف دوست ہیں، دوران گفتگو پروفیسر عبدالعزیز المیمنی، پروفیسر خورشید احمد فارق، پروفیسر عبدالعلیم صاحب اور پروفیسر نذیر احمد صاحب زیر بحث آئے، اوّل الذکر کے بارے میں تو میں نے پڑھا تھا باقی اساتذہ کرام کا نام پہلی بار وہاں سننے کو ملا، پروفیسر شروانی صاحب کا انداز گفتگو سادہ، سلیس اور علمی تھا، وہ کسی کی نکتہ چینی نہیں کرتے تھے بلکہ کھلے دل سے علمی مقام ومرتبہ کا اعتراف کرتے تھے، دونوں شخصیتیں مختلف علمی منصوبوں پر گفتگو کرتی رہیں اور میں خاموشی سے ان کی گفتگو سنتا رہا، آخر میں شروانی صاحب نے بتایا کہ وہ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس دفتر سے آرہے ہیں، رخصت ہوتے ہوئے انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ آپ کیا کررہے ہیں؟ قبل اس کے کہ میں کچھ جواب دیتا پروفیسر آرزو صاحب مرحوم نے میرا تعارف کرادیا۔ شروانی صاحب بہت خوش ہوئے اور اپنے گھر حبیب منزل کے لئے اپنی گاڑی میں سوار ہوگئے، تقریباً ایک ہفتہ بعد آرزو صاحب نے ایک خط میرے حوالہ کیا کہ میں وہ خط شروانی صاحب کو دے آؤں، مجھے پتہ معلوم نہیں تھا انہوں نے حبیب منزل، میرس روڈ بتادیا، جب میں شروانی صاحب کے پاس گیا تو وہ اپنے کمرہ میں کچھ لکھنے میں منہمک تھے، میز پر سامنے انگریزی اخبار تھا اور شاید ماہنامہ کانفرنس گزٹ کے لئے اداریہ لکھ رہے تھے، سلام کرکے میں نے خط سپرد کیا اور رخصت ہونا چاہا تو فوراً اپنے پاس بٹھالیا اور میری

خیریت دریافت کرتے رہے اور شعبہ عربی مسلم یونیورسیٹی کے اساتذہ کے احوال پوچھتے رہے ۔ اور اپنے ماضی کے لمحات کی داستان سناتے رہے ، میں بہت دلچسپی سے سنتا رہا اور ان سے مستفید ہوتا رہا ، پھر ان سے ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہوگیا ، اس کے بعد سے انہوں نے مجھ پر محبت وشفقت کا جو سلسلہ شروع کیا وہ آخر عمر تک رہا ، اگر ہفتہ ، دس دن ان سے ملنے نہیں جاپاتا تو فوراً اپنے خادم راشد سے فون کراتے یا شعبہ عربی میں رقعہ بھیج دیتے ، یہ تھی ان کی شفقت ومحبت ایک چھوٹے سے طالب علم کے لئے دوسرے اساتذہ کے لئے لائق تقلید ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ پروفیسر شروانی صاحب ایک بلند حوصلہ، مایہ ناز محقق ، بے باک صحافی ، انشاء پرداز ، نہایت خلیق وملنسار ، چھوٹوں پر شفقت ومحبت کرنے والے ، اور بے پناہ ذہانت کے مالک تھے ، ان کے حافظہ کا یہ عالم تھا کہ دوران طالب علمی سے لیکر آخر تک کے سارے واقعات وحوادث ذہن میں محفوظ تھے ، اپنے دادا مرحوم نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے زمانہ میں حبیب منزل میں آنے والے بڑے بڑے عمائدین وقائدین کی باتیں انہیں ازبر تھیں ۔ ایک مرتبہ مجھ سے کہنے لگے کہ میرے ساتھ انگلش ہاؤس چلئے ، میں نے دریافت کیا کہ یہ کہاں ہے؟ اس بات پر وہ مخصوص انداز میں مسکرائے اور بولے : ایم ایم ہال چلئے ! میں تیار ہوگیا ، انہوں نے اپنے ساتھ کار میں بٹھایا اور ہم لوگ ایم ایم ہال چل دئے ، جب ہم نے ڈائننگ ہال کی طرف رخ کیا تو گاڑی سے اتر کر بولے کہ آیئے آپ کو میں اپنا کمرہ دکھاتا ہوں اور ایک کمرہ کی طرف اشارہ کر کے بولے کہ یہی میرا کمرہ ہے ۔ اسی کو میرے زمانے میں انگلش ہاؤس کہا جاتا تھا ۔ پوری عمارت کے اردگرد چکر لگاتے رہے اور اپنے زمانہ طالب علمی کے واقعات ولمحات سناتے رہے یہ تقریباً ۲۰۰۷ء کی بات ہے۔

مارچ ۲۰۰۸ء سے شعبہ عربی دہلی یونیورسیٹی میں ’’فارق میموریل لیکچر سیریز‘‘ کا انعقاد عمل میں آیا ، شعبہ عربی دہلی یونیورسیٹی نے اپنے سیریز کے پہلے لیکچر کے لئے شروانی صاحب مرحوم کا انتخاب کیا ، یہ ایک حسن انتخاب تھا ، شروانی صاحب نے پروفیسر خورشید احمد فارق صاحب مرحوم کی کتاب ’’جائزے‘‘ کا تنقیدی وتحلیلی جائزہ پیش کیا ، دہلی جانے کیلئے شروانی صاحب نے راقم الحروف کو رفیق سفر بنایا ، پورے سفر میں شروانی صاحب نے اس ناچیز پر جس اخلاص ، محبت وشفقت کا اظہار فرمایا وہ یہاں اس مختصر مضمون میں بیان نہیں کیا جاسکتا ، وہ لمحات آج بھی میرے حافظہ میں محفوظ ہیں۔

یہاں یہ بات معذرت کے ساتھ عرض کرتا چلوں کہ مجھے صرف اس مضمون میں شروانی صاحب کے علمی وادبی کارناموں سے قارئین کو روشناس کرانا ہے نہ کہ ان کی مدح سرائی میں صفحات سیاہ کرنے ہیں کیونکہ ہر صاحب علم و دانشور اپنے علم ، دانشوری وکارناموں کی بدولت زندہ رہتا ہے ، بے جا مدح سرائی اور لفاظی ایک لغو عمل ہے اور اس عمل سے شروانی صاحب مرحوم پوری زندگی اجتناب کرتے رہے۔

شروانی صاحب مرحوم کی پیدائش حبیب گنج میں ۱۹۲۴ء میں ہوئی ، ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی جس میں مذہبی تعلیم زیادہ تھی ، والد مرحوم الحاج عبید الرحمٰن خاں شروانی صاحب نے اپنے خاص توجہ وعنایت سے ان کی تربیت کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی ، اس کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسیٹی سے ۱۹۴۲ء میں ہائی اسکول ، ۱۹۴۴ء میں انٹرمیڈیٹ اور ۱۹۴۶ء میں بی۔ اے کے امتحانات فرسٹ ڈویژن سے پاس کئے ، اپنے اسکول کے دور طالب علمی میں انگلش ہاؤس میں ۱۹۳۸ء سے ۱۹۴۲ء تک قیام پذیر رہے ۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۷ تک آفتاب ہوسٹل میں رہے ، ۱۹۴۷ء میں بالوجوہ انہیں پاکستان جانا پڑا ، ایک سال (۱۹۴۷۔۱۹۴۸) اورینٹل کالج لاہور کے طالب علم رہے ، ایم۔ اے عربی کی تکمیل وہیں سے کی۔

مفتی عبداللطیف سابق صدر سنی دینیات مسلم یونیورسیٹی علی گڑھ سے ذاتی طور پر دوقسطوں ۱۹۴۲ء تا ۱۹۴۷ء اور ۱۹۴۹ء تا

۱۹۵۳ء فقہ، حدیث، قرآن، منطق اور علم کلام کی تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۷۰ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسیٹی سے کتاب ''الجلیس والأنیس للمعافی بن زکریا'' ایڈٹ کر کے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کیا، ان کا یہ کام دائرۃ المعارف حیدرآباد سے ۱۹۹۴ء میں شائع ہوگیا ہے۔

ایک سال (۱۹۵۶ء۔۱۹۵۷) قاھرہ یونیورسیٹی میں دکتورہ سھیر قلماوی کی زیرنگرانی جدید عربی ادب کا مطالعہ کیا۔ اپنے دوست ڈاکٹر خورشید احمد فارق اور ڈاکٹر عبدالحلیم ندوی صاحب (آخرالذکر اس وقت ڈاکٹر نہیں تھے) کے ساتھ رہتے تھے اور دونوں نے ہی علم وادب کے میدان میں کارہائے نمایاں انجام دئے۔

۱۹۵۳ء میں علیگڑھ مسلم یونیورسیٹی کے شعبہ عربی میں لیکچرر کے عہدے پر فائز ہوئے اور ۱۹۸۳ء میں کشمیر یونیورسیٹی چلے گئے وہاں ۱۹۸۸ء تک پروفیسر وصدر شعبہ عربی کے طور پر خدمات انجام دیتے رہے اور شعبہ عربی کو ترقی کے منازل طے کرانے میں ہمیشہ سرگرداں رہے، عربی میں ان کا کام عباسی دور پر ہے اور انہیں زیادہ دلچسپی جدید عربی ادب سے رہی ہے اور اسلامیات میں ان کی دلچسپی کا موضوع ۱۸۵۷ء کے بعد کا ہندستان ہے۔

عربی کے اساتذہ میں شروانی صاحب مرحوم اپنے دو استادوں سے زیادہ متأثر ہوئے، ڈاکٹر سید محمد یوسف صاحب نے انہیں انٹرمیڈیٹ اور بی۔اے میں عربی پڑھائی اور ایم۔اے میں پروفیسر عبدالعزیز میمنی صاحب نے۔ ان کے علاوہ انہیں قاھرہ کے دکتورہ سھیر قلماوی نے بھی بہت متأثر کیا، ڈاکٹر سید محمد یوسف صاحب کا علمی انکسار اور شفقت، پروفیسر میمنی صاحب کی علمیت و حافظہ اور دکتورہ سھیر قلماوی کی باوقار شخصیت اور علمی استعداد بہت متأثر کن ہیں، علی گڑھ مسلم یونیورسیٹی میں انہوں نے کل ۳۰ سال بحیثیت استاد کام کیا۔ ۱۵ سال ڈاکٹر عبدالعلیم صاحب مرحوم کی صدارت میں اور ۱۵ سال پروفیسر مختارالدین احمد صاحب مرحوم کی صدارت میں، ان دونوں کو وہ اپنا محسن ومشفق مانتے تھے۔

ڈاکٹر طہ حسین قاھرہ یونیورسیٹی میں تاریخ اور نقد ادب پر لیکچر دیتے تھے جن میں کوئی بھی شریک ہوسکتا تھا، پروفیسر شروانی صاحب ان لیکچروں میں پابندی سے شرکت کرتے تھے اور مستفید ہوتے تھے انہیں سننا ان کے لئے ایک خوشگوار تجربہ ہوتا تھا۔

حقیت یہ ہے کہ پروفیسر ریاض الرحمٰن خاں شروانی صاحب مرحوم کی شہرت بے باک صحافی، محقق ودانشور کے شروع سے ہی رہی ہے، کانفرنس گزٹ میں اپنے بے باک اداریوں اور مخصوص نقد نوٹس کے ذریعہ علمی حلقوں میں زیادہ مشہور ہوئے، انہوں نے مختلف رسائل وجرائد میں مضامین، اداریے، مراسلے اور تبصرے لکھے ہیں۔ بہت سے اساتذہ کے شخصیاتی مضامین میں مدح سرائی زیادہ اور علمی حقائق کم پیش ہوتے ہیں لیکن اگر پروفیسر شروانی صاحب مرحوم کے مقالات، خطبات وتحریریں دیکھی جائیں تو دوسرے معاصر اساتذہ میں ان کا مقام ومرتبہ منفرد ہے۔ ان کا سب سے بڑا صحافتی کارنامہ'' رسالہ کانفرنس گزٹ'' کی ادارت ہے، کانفرنس گزٹ کا آغاز ۱۹۱۸ء میں ہوا اور ۱۹۵۰ء تک بلا ناغہ پابندی سے شائع ہوتا رہا، لیکن اس کی اشاعت درمیان میں کچھ وجوہات کی بناء پر وقفے کے ساتھ ہوتی رہی، شروانی صاحب مرحوم نے ۲۰۰۲ء سے اسے نکالنا شروع کیا اور بلا ناغہ دسمبر ۲۰۱۶ء تک جہد مسلسل کے ساتھ نکالتے رہے جو ان کے مخصوص حواشی ونوٹس سے مزین ہوتے تھے اور قارئین ہمیشہ اس کی اشاعت کے منتظر رہتے تھے لیکن کچھ وجوہات کی بنا پر اس کی ادارت سے سبکدوش ہوگئے اور ایک رسالہ'' فکرنو'' کے نام سے نکالنا شروع کردیا، انکے علمی حواشی ودلچسپ نوٹس کی وجہ سے رسالہ کانفرنس کے نصف سے زیادہ قارئین'' فکرنو'' کی طرف متوجہ ہوگئے اور یہ رسالہ ان کی آخر عمر تک بلا ناغہ نکلتا رہا۔ لیکن اب وہ اداریے، وہ علمی حواشی کہاں دیکھنے کو ملیں گے جس کے تلاش ہر ایک طالب علم کو رہتی تھی۔ اس سرزمین پر علم تو بہت لوگوں کے پاس ہے لیکن وہ حسن اخلاق، ادب، چھوٹوں پر شفقت ومحبت جیسی خوبیوں سے عاری ہیں اور یہ ساری خوبیاں پروفیسر ریاض الرحمٰن خاں شروانی صاحب مرحوم کے اندر موجود تھیں۔ اللہ تعالی ان کی قبر کو نور سے بھر دے اور سیئآت کو

تعلیم و تربیت

نوجوانی (Teen age) اور اس کی بعض خصوصیات

تلخیص و ترجمانی
ڈاکٹر طارق ایوبی

حسنات سے بدل دے (آمین)۔ ☆☆☆

نوجوانی کا مزاج:

نوجوانی (یعنی ۱۱ تا ۱۸) کی عمر میں بچہ بہت سی تبدیلیوں سے گذرتا ہے، وہ بچپن سے پختگی اور شباب کی طرف منتقل ہوتا ہے، ایک باپ اور ایک بیٹے نے اپنی اپنی حیثیت کے مطابق بچپن کے مرحلہ میں ایک دوسرے سے تعامل کے اصول وطریقے سیکھے، تو اب یہ بھی ضروری ہے کہ دونوں نوجوانی کے مرحلہ میں ایک دوسرے سے تعامل کے لیے نئے اصول وقواعد سیکھیں، منتقلی و تبدیلی کے اس مرحلہ میں عام طور پر والدین کو پریشانی ہوتی ہے، کیونکہ سب کچھ اچانک اور بہت تیزی سے تبدیل ہوتا ہے، ابھی کچھ ہی سال قبل آپ ایک چھوٹے بچے کی تعلیم وتربیت میں مصروف تھے، وہی اب آپ کے سامنے ایک نوجوان کی شکل میں کھڑا ہے، بہت ممکن ہے کہ وہ قد وقامت میں بھی آپ سے بڑا ہو، اب اس کی خواہش ہوگی کہ اس کے ساتھ بڑوں کی طرح معاملہ کیا جائے، وہ بچپن کو پیچھے چھوڑ دینے کا خواہاں ہوگا، چنانچہ بہت سے والدین کو اس مرحلہ میں بڑی مشکلات پیش آتی ہیں، ان کو لگتا ہے کہ ہر وقت ان کی انا وحاکمیت یا ان کے بڑکپن کو چیلنج کیا جارہا ہے، جو بچہ ابھی تک کمالِ سعادت مندی کے ساتھ ماں باپ کے فیصلوں کو قبول کرتا تھا، وہی اب اپنے فیصلے خود کرنا چاہتا ہے، اور چاہتا ہے کہ اپنی خواہش کے مطابق آزادی کے ساتھ جو چاہے کرے، دوسری طرف اہل خانہ کو یہ لگتا ہے کہ گویا ان کے سامنے کوئی اجنبی ہے جس سے وہ واقف ہی نہیں ہیں، نہ اس کے مزاج سے واقف ہیں نہ اس کے افکار واحساسات اور طرز عمل سے، گویا وہ گھر پہلے سا گھر نہ ہو بلکہ اس کے لیے محض ایک اسٹیشن ہو جہاں زندگی کی گہما گہمی ہو، شور شرابہ ہو، بعض والدین اسی تعلق سے اپنی پریشانی اور اپنے احساسات کا اظہار کرتے ہوئے یوں کہتے ہیں:

- یہ تو بہت نرم مزاج تھا، بڑی محبت کرتا تھا، اب تو یہ ذرا سی بات پر غصہ ہوتا ہے اور چلاتا ہے۔
- ان دنوں یہ بالکل بھی میرا تعاون نہیں کرتا۔
- یہ تو ہمیشہ مسکراتی رہتی تھی لیکن اب تو ہر پل اس کا مزاج بدلتا رہتا ہے۔
- ان دنوں یہ بات بات میں مجھ سے جھگڑتی اور تکرار کرتی ہے۔

بہت سے والدین نوجوانی کے مرحلہ میں ہر ہر بات پر توجہ نہیں دیتے، بہت کم امور میں توجہ دیتے ہیں، اس لیے ان کے گھر میں ماحول بہت پرسکون رہتا ہے، بڑی راحت رہتی ہے، کیونکہ یہ والدین اس نوجوان کو اس طرح دیکھتے ہیں کہ گویا ایک نیا پختہ عقل کا انسان ان کی زندگی میں آیا ہے، ایسا اس لیے ممکن ہوتا ہے

کہ ان والدین کی نظر آگے کی طرف ہوتی ہے اور وہ زندگی کو اب نئے اور دوسرے نقطۂ نظر سے دیکھ رہے ہوتے ہیں، اس نوجوان کی آمد پر وہ فخر محسوس کرتے ہیں، ان کی نظر اب اس پر ہوتی ہے کہ بچپن میں اس سے جو توقعات وابستہ کی گئی تھیں اب وہ کیسے پوری ہوں، اور کیسے مستقبل تابناک وروشن ہو۔

کیا یہ والدین زیادہ خوش قسمت ہیں اور جو اس مرحلہ میں پریشانیوں سے دوچار ہیں وہ کم نصیب ہیں، یا پھر قسمت ونصیب کے علاوہ معاملہ کچھ اور ہے۔

درحقیقت اس کا راز والدین کی قدرت اور اس نوجوان کے تغیرات اور بہت تیزی سے رونما ہونے والی تبدیلیوں کو قبول کرنے کی صلاحیت میں پوشیدہ ہے، اسی طرح یہ بھی اہم ہے کہ وہ اس کے ساتھ تعامل میں اپنا کردار کس طرح تبدیل کرتے ہیں۔

بڑوں کی زندگی میں تین چار سال کی مدت کی کوئی اتنی اہمیت نہیں ہوئی، اتنی مدت میں کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوتی، مگر نوجوانی میں اتنی مدت بڑی اہم ہوتی ہے، ایک بچہ بچپن کے مرحلہ سے نوجوانی کے مرحلہ میں منتقل ہوتا ہے، اب آپ اس کو ایک بچہ ہی سمجھ کر مخاطب کرتے ہیں جبکہ وہ نوجوانی کی دہلیز پر قدم رکھ چکا ہوتا ہے اور بچپن کی یادیں بھلا چکا ہوتا ہے، آپ اس کے ساتھ ماضی جیسا معاملہ کرنا چاہتے ہیں اور وہ اس ماضی سے چھٹکارا حاصل کر کے مستقبل کی طرف دیکھ رہا ہوتا ہے، اس کی تمام تر توجہ ان ہی آنے والے ایام پر مرکوز ہوتی ہے، اس کو یوں سمجھیے کہ جنوبی افریقہ کے بعض قبائل میں یہ رسم ہے کہ پورا قبیلہ ایک ساتھ گاؤں سے باہر جاتا ہے، پھر وہاں ہر نوجوان کے لیے الگ الگ پھوس کی ایک جھونپڑی بنائی جاتی ہے، جو گویا اس کے ایام طفلی کی علامت ہوتی ہے، ہر نوجوان اس کو اپنے ہاتھ سے آگ کے حوالے کر دیتا ہے، اسے جلا کر اپنے گاؤں واپس آجاتا ہے، پلٹ کر ایک بار بھی اس کی طرف نہیں دیکھتا، یہ اس بات کی علامت ہوتی ہے کہ اب وہ مستقبل کی طرف دیکھ رہا ہے اور بڑوں کی طرح ذمہ داری اٹھانے کے لیے تیار ہے۔

اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ عنفوان شباب کی بیشتر خصوصیات اسی زندگی پر مبنی ہوتی ہیں جو زندگی پہلے گذر چکی ہے، چنانچہ ایام طفلی میں اگر والدین کے تعلقات بچے کے ساتھ مثبت، خوشگوار اور اچھے رہے ہیں تو عنفوان شباب کے اس مرحلہ میں بھی ان تعلقات میں ہم آہنگی اور سکون واطمینان ہوگا، البتہ بہت سے والدین کو اس حقیقت کو قبول کرنے میں بڑی پریشانی ہوتی ہے کہ بچہ اب تبدیلی کے مرحلہ سے گذر رہا ہے، اب ظاہر ہے کہ وہ پھر کبھی بچپن میں واپس نہیں جائے گا، ان کے درمیان جو تعلقات تھے اور جو انھیں باہم مربوط کرتے تھے ان کی کیفیت کی تبدیلی سے وہ بہت پریشان ہوتے ہیں، اس کے بالمقابل بہت سے والدین کو اس کے ساتھ تعامل وبرتاؤ میں دشواری پیش آتی ہے، لیکن ان کے پاس اس کی اہلیت ہوتی ہے کہ وہ اس کو اس کی ابھرتی ہوئی جوانی کی رعایت کے ساتھ مخاطب کریں، چنانچہ ان کو نوجوان بچے کے ساتھ ایک دوست اور ایک ساتھی جیسا برتاؤ کر کے بڑی راحت حاصل ہوتی ہے۔

اگر نوجوان بچے کو ہم اس نظر سے دیکھیں کہ اس مرحلہ میں خود اس کی ذات کے اسرار اس پر کھلتے ہیں، اس کو اپنی شخصیت کی شناخت ہوتی ہے تو اس سے بڑا فائدہ ہوگا، افراد خانہ اور والدین سے الگ اس کی اپنی ایک مستقل شناخت وشخصیت ہوتی ہے، اس نے پہلے یہ جانا تھا کہ ایک بچہ کیسا ہوتا ہے، اب اس کو یہ جاننا ہے کہ ایک پختہ عقل اور باشعور نوجوان کیسا ہوتا ہے، اس کو یہ بھی سیکھنا ہے کہ خود اپنے آپ کو کس طرح دیکھے، کس زاویہ سے اپنی شخصیت کو برتے جو زاویہ وطریقہ بچپن کی غیر ذمہ دارانہ زندگی سے مختلف ہو، اسی لیے اس مرحلہ میں اس کے تمام تر اقدامات و رویّے محض تجربہ وکوشش کی قبیل سے ہوتے ہیں، وہ دراصل اپنی ہی صورت میں ایک نئے انسان کی شناخت کرنے کی کوشش کرتا ہے، اسی طرح مندرجہ ذیل امور بھی وہ ازسرِ نو سیکھتا ہے:

- دوسروں کے ساتھ برتاؤ کے نئے طریقے۔

- ایسے وسائل تلاش کرتا ہے جس سے وہ اپنی آزادی کو یقینی بنا سکے۔
- دوسروں کے سامنے کس طرح آئے اور دوسروں کو کس زاویہ نگاہ سے دیکھے۔
- زندگی کے نئے اہداف متعین کرتا ہے، نئی خواہشات اور نئی امنگیں ہوتی ہیں۔
- نئے احساسات ہوتے ہیں، کبھی کبھی ''ایمان'' سے شناسائی ہوتی ہے یا زندگی کے کوئی اور نئے معانی سامنے آتے ہیں۔

اس پر ان سب حقائق کے کھلنے کے باوجود اُس کو اِس سلسلہ میں بہت کم یقین ہوتا ہے کہ وہ ایک مرد یا عورت کی حیثیت سے کامیاب ہوگا، اور اس کو تذبذب رہتا ہے کہ اس کے دوستوں ساتھیوں یا سہیلیوں کی طرف سے اور جنس مخالف کی طرف سے اس کی پذیرائی ہوگی یا نہیں۔

ان ہی سب وجوہات کے سبب کہا جاتا ہے کہ عنفوان شباب کا یہ مرحلہ خود نوجوان کے لیے بھی بہت مشکل ہوتا ہے اور اس کے والدین کے لیے بھی بہت پریشان کن ہوتا ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی یہ مرحلہ وفورِ شوق، فعالیت اور زندگی و نشاط سے بھرپور ہوتا ہے، اس مرحلہ میں اثر انداز ہونے کا جذبہ ہوتا ہے، اس مرحلہ کی مشکلات کو جو چیز آسان کرسکتی ہے وہ یہ ہے کہ عنفوان شباب کے مزاج اور تبدیلیوں کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے۔

جسمانی نمو!

عنفوان شباب میں بہت تیزی کے ساتھ جسمانی تغیرات واقع ہوتے ہیں، اس مرحلہ میں اچانک جسم، ایک بچے کے جسم سے تبدیل ہوکر ایک ''مرد'' یا ایک ''عورت'' کا جسم ہو جاتا ہے، مثلاً لڑکا ہے تو اس کے کندھے چوڑے ہوتے ہیں، پٹھے بڑھتے ہیں، لڑکی ہوتی ہے تو اس کے ثدیین (پستانوں) کا ظہور ہوتا ہے، کولہے بڑھتے ہیں، عام طور پر دونوں جنس میں ۱۲ر سال کی عمر کے بعد موئے زیر ناف کا ظہور ہونے لگتا ہے (علاقہ اور موسم کے لحاظ سے ہر جگہ ان چیزوں کے ظہور کی مدت الگ الگ ہوسکتی ہے)، لڑکے کے مونچھ ڈاڑھی عام طور پر ۱۶ر سال کی عمر میں نکلنے لگتی ہے، لڑکی کو پہلی مرتبہ ۱۲ر سال کی عمر میں حیض (Menstruation) آتا ہے، اس کے برخلاف لڑکے کی آواز چودہ پندرہ سال کی عمر میں تبدیل ہونے لگتی ہے جو بلوغ کی علامت سمجھی جاتی ہے۔

اس مرحلہ میں جسمانی نمو کی ایک خاص بات یہ ہے کہ اس میں بڑی تیز رفتاری ہوتی ہے، بہت تیزی کے ساتھ ہاتھوں پیروں کی لمبائی بڑھتی ہے، بچہ عام طور سے اچانک اس تبدیلی کا عادی نہیں ہوتا، بسا اوقات وہ صحیح طریقہ سے ہاتھ پاؤں پر قابو نہیں رکھ پاتا، کبھی وہ کس چیز سے ٹکرا جاتا ہے تو کبھی اس سے کوئی چیز چھوٹ کر گر جاتی ہے، بالآخر وہ اس نمو کی کیفیت سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔

اس جسمانی نمو میں چہرے کے آثار تبدیل ہو جاتے ہیں، ایک بچے کا ''نرم'' چہرہ ایک پختہ مرد و عورت کے چہرے میں تبدیل ہو جاتا ہے، نوجوان اپنے چہرے کی اس تبدیلی پر سخت حیرت میں ہوتا ہے، کیونکہ وہ اس تبدیلی سے بالکل بھی مانوس نہیں ہوتا، بالخصوص اس تبدیلی کی ابتدا میں چہرے کے تمام حصوں (Face Cut) مثلاً پیشانی، جبڑوں، ناک کان وغیرہ میں پورے طور پر یکسانیت نہیں ہوتی۔

عام طور پر لڑکیاں لڑکوں سے جلدی بالغ اور جوان ہو جاتی ہیں، اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ چند ماہ بڑی لڑکی لڑکے سے زیادہ لمبی ہو جاتی ہے، ۱۶ر سال کی عمر میں لڑکی مکمل طور پر جوان ہو جاتی ہے جبکہ لڑکے کی نشو ونما آہستہ آہستہ ہوتی ہے، وہ عام طور پر ۱۸ر سال کی عمر میں یا اس کے بعد مکمل جوان ہوتا ہے۔

یہ بھی فائدے سے خالی نہیں کہ اس مرحلہ میں بچوں کے جسمانی نمو (Physical Growth) اور بلوغ میں پائے جانے والے واضح فرق کو ملحوظ رکھا جائے، بہت سے بچوں کا ان

کے اسکول میں ان کے ہم عمروں سے موازنہ کیجئے تو ان کا جسمانی نمو دوسروں کے بالمقابل بہت دیر سے ہوتا ہے، اگر ایسا ہو تو اس میں پریشانی اور فکر کی کوئی بات نہیں، سوائے اس کے کہ بعد میں جسمانی نمو کے باوجود دوسروں کی طرح اتنا شعور نہ پیدا ہو جتنا ہونا چاہیے، البتہ اگر نمو میں ضرورت سے زیادہ تاخیر محسوس ہو تو پھر والدین فیملی ڈاکٹر یا بچوں کے ڈاکٹر سے مراجعت کر سکتے ہیں، لیکن غالب گمان یہی ہے کہ ڈاکٹر صبر و انتظار کا مشورہ دیں گے، اگر واقعی جسمانی نمو میں تاخیر کا کوئی قابلِ علاج سبب ہوگا تو وہ اس کے لیے جانچیں کرائیں گے اور مناسب علاج تجویز کریں گے۔

نوعمر بچوں سے گفتگو:

جب بچہ نوجوانی کی دہلیز پر قدم رکھتا ہے تو اس کی قوت تفکیر بھی پختہ عقل بڑوں جیسی ہونے لگتی ہے، انسان کی ذہانت ۱۶؍سال کی عمر میں اپنی انتہا کو پہنچ جاتی ہے، حالانکہ اس کے سیکھنے کا سلسلہ ہمیشہ ہی جاری رہتا ہے، اس مرحلہ میں نوجوان اس قابل ہوتا ہے کہ وہ اچھی طرح کسی بھی صفت کے معانی میں غور و فکر کر سکے، مثلاً وہ ''آزادی''، ''امن'' اور ''عدل'' و ''محبت'' کے مفہوم میں ذاتی طور پر غور و فکر کرنے کا اہل ہوتا ہے۔

اس مرحلہ میں جو تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں ان کے سبب یہ نوجوان اچانک ایک مثالی انسان کی صورت میں ابھر کر سامنے آتا ہے، اسی لیے ہم عام طور پر نوجوانوں کو دیکھتے ہیں کہ وہ اپنے سے بڑوں پر تنقید کرتے ہیں، اپنے گرد و پیش کے ماحول پر تنقید کرتے ہیں، اسی طرح دنیا کے حالات پر تنقید کرتے ہیں، اس کے اندر آزادی اور اپنی ذاتی شناخت کی تکوین و تشکیل کا غیر معمولی جذبہ ہوتا ہے اسی لیے وہ اقدار و روایات اور عام رواج سے باغی ہوتا ہے بلکہ ان چیزوں کے بالمقابل سرکشی کرتا ہے، اس مرحلہ میں میں اس کے معاملات بہت واضح ہوتے ہیں، وہ بہت آسانی کے ساتھ اس کا دعویٰ کرتا ہے کہ اس کے گرد و پیش جو کچھ ہو رہا ہے اسے وہ سمجھ رہا ہے، وہ سمجھ رہا ہے کہ معاملات کیسے ہونے چاہئیں، کہاں خطا واقع ہو رہی ہے، حالات کو بہتر بنانے کے لیے کیا ہوسکتا ہے، وہ محسوس کرتا ہے کہ دنیا کو بدل ڈالنے کی اس کے اندر قدرت ہے، اسی لیے وہ اپنے ساتھ موجود اپنے بڑوں کے بالمقابل بہت کم صبر کر پاتا ہے، اس کی خواہش ہوتی ہے کہ بغیر کسی تاخیر کے معاملات کو بالکل درست کر دیا جائے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس ''مثالی'' صورت حال یا ''مخالف'' حالت کے ساتھ زندگی گذارنا بہت مشکل امر ہے، بعض مرتبہ بعض نوجوان اسی وجہ سے استہزا پر آمادہ ہوجاتے ہیں، وہ اپنے گرد و پیش موجود لوگوں کا مذاق بناتے ہیں، وہ اقدار، عام رواج، سیاسی و اجتماعی نظام کا مذاق بناتے ہیں، بچپن کی سختیوں کا مذاق اڑاتے ہیں، بات یہاں تک پہنچ جاتی ہے کہ وہ اس کی قیمت ہی نہیں سمجھتے، وہ کسی چیز کی پرواہ نہیں کرتے، حتی کہ والدین، بھائیوں اور دیگر افرادِ خاندان کے افکار کا مذاق بناتے ہیں۔

اس مرحلہ کی مشکلات میں مزید پیچیدگی پیدا ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ نوجوان کے اندر ذاتی نوعیت کے مسائل میں غور و فکر کی اہلیت ہوتی ہے، لیکن ابھی اس میں شعور و جذبات کے تئیں پختگی نہیں ہوتی، یہی وجہ ہوتی ہے کہ دوسروں پر تنقید کرنے کے باوجود وہ خود اپنے خاص رویّہ پر قابو پانے پر قادر نہیں ہوتا، اسی لیے لوگوں سے جس چیز کا مطالبہ کرتا ہے خود اس کو انجام نہیں دے پاتا، اکثر و بیشتر والدین اس صورت حال میں اس کو زیادہ سے زیادہ یہ اشارہ کرنے پر قادر ہوتے ہیں کہ ''تم جو کہہ رہے ہو وہ کرتے نہیں''، اس سے پیچیدگی مزید بڑھ جاتی ہے۔

یہاں یہ ذکر کر دینا بھی فائدے سے خالی نہیں کہ نوعمر بچہ والدین کی حاکمیت و تسلط اور برتری کو چیلنج کرنے کی ضرورت محسوس کرتا ہے، اسی لیے وہ اپنی رائے، اپنے افکار اور اپنی قوت فہم کے اظہار کی تاک میں رہتا ہے، اسی لیے بسا اوقات آپ دیکھیں گے کہ وہ صرف آپ سے بحث برائے بحث کرے گا اور

آپ کے برخلاف اپنے موقف کا اظہار کرے گا، اب اگر آپ نے تردد کا اظہار کیا اور بطور والد اپنی حیثیت کا اظہار کیا ''ایسے مت بولو میں تمہارا باپ ہوں''، تو اس سے اس کے اندر یہ احساس پیدا ہوگا کہ وہ بحث میں جیت گیا، اور اس کا موقف صحیح تھا۔

اسکول میں ہم نے بعض ایسے اساتذہ کو دیکھا جو اپنے نوعمر طلبہ کے ساتھ پوری طرح گھل مل جاتے ہیں، ان کے ساتھ اس قدر ہم آہنگی ہوتی ہے کہ وہ طلبہ ان کا احترام کرتے ہیں اور ان کے ساتھ وقت گذارنے میں بہت راحت وسکون محسوس کرتے ہیں، ان کے ساتھ گفتگو کر کے اور ان کی باتیں سن کے وہ محظوظ ولطف اندوز ہوتے ہیں، اساتذہ کی ایک دوسری قسم بھی ہمارے مشاہدہ میں ہے، ان کا ہمیشہ اپنے طلبہ کے ساتھ اختلاف رہتا ہے، ان کے سامنے یکے بعد دیگرے مشکلات پیش آتی ہیں، وہ طلبہ کی جانب سے احترام حاصل نہیں کر پاتے، بلکہ وہ طلبہ کے درمیان مذاق واستہزاء کا ہدف بن جاتے ہیں، دراصل بات یہ ہوتی ہے کہ ان نوجوان طلبہ کو ان اساتذہ کی کمزوری معلوم ہو جاتی ہے کہ وہ ان کو قابو کرنے سے قاصر ہیں، ان سے تعامل کرنے اور مخاطب کرنے کی ان میں صلاحیت نہیں ہے، اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ یہ اساتذہ ان طلبہ کو سمجھ ہی نہیں پاتے کہ دراصل وہ استاد سے کیا چاہتے ہیں۔

چنانچہ کامیاب وناکام مدرس میں فرق اس طرح کیا جاسکتا ہے کہ کون نوجوان کے مزاج اور اس کے اندر واقع ہونے والے تغیرات کو سمجھتا ہے اور کون اس کو سمجھنے سے قاصر ہے، خاص طور پر ایسے مواقع پر جبکہ (ہم نے پہلے ذکر کیا) نوجوان کچھ کام محض تجربہ کے لیے کرتا ہے، تعامل وبرتاؤ کے طریقوں کو جانچنے کے لیے کرتا ہے، وہ اپنی شخصیت کی شناخت ایک پختہ عقل (Mature) جوان کے طور پر کرنے کی کوشش کرتا ہے، وہ دوسروں کے ساتھ اپنے نئے تعلقات کی نوعیت کا تجربہ کرنا چاہتا ہے، وہ اپنے افکار کی نوعیت اور دوسروں پر ان کی تاثیر کے طریقوں کا تجربہ کرنا چاہتا ہے، کامیاب مدرس ان تمام چیزوں کا لحاظ کرتے ہوئے اس کے ساتھ بڑی حکمت سے پیش آتا ہے اور بامقصد طریقہ سے تعامل کرتا ہے اور ان کے ساتھ اس معیار کے تعامل سے لطف اندوز ہوتا ہے، وہ اس نوجوان کو اس طرح دیکھ کر خوشی محسوس کرتا ہے کہ وہ زندگی کا پختہ تجربہ رکھنے والے بڑی عمر کے لوگوں کی طرح تبدیل ہو رہا ہے، وہ ان کے ساتھ کچھ وقت خوشگوار انداز میں گذارتا ہے، وہ سکون محسوس کرتا ہے اور نوجوان کی مثالی سوچ (Idealism) کا احترام کرتا ہے، کبھی کبھی بعض امور وموضوعات سے متعلق ان کے مذاق کو بھی سمجھتا ہے، وہ جانتا ہے کہ یہ چیزیں وقتی ہیں جو نمو اور تبدیلی کے اس مرحلہ کے ساتھ خاص ہیں، وہ یہ بھی سمجھتا ہے کہ دور اندیشی کے وقت اس کو کسی طرح دور اندیشی برتنا ہے، وہ اپنے طلبہ کی بات سننے کے لیے ہر وقت مستعد رہتا ہے، یہی نہیں بلکہ وہ باہمی گفتگو اور سوال وجواب اور ردّ وقبول کے لیے بھی تیار رہتا ہے، اس باہمی تبادلۂ خیال میں بعض نکتوں کا لحاظ رکھتا ہے، اگر اس کو اپنی رائے کے برحق ہونے کا یقین ہو تو مضبوطی سے اس پر قائم رہتا ہے، اور اگر خطا کا امکان سمجھتا ہے تو اپنی رائے سے رجوع کر لیتا ہے، درحقیقت اس کامیاب استاد کو اپنے طلبہ کے اظہار رائے اور تفکیر وتدبر اور حوصلہ افزائی کے لیے اپنے کردار (Role) کا صحیح ادراک ہوتا ہے، وہ چاہتا ہے کہ یہ طلبہ اپنی زندگی اور اپنے مستقبل کے بارے میں غور وفکر سے کام لیں، ان کے پاس ان کے اپنے تئیں ذاتی افکار ہوں نہ کہ وہ صرف بڑوں کے تجربات اور افکار پر اکتفا کریں، سب سے اہم بات اس کامیاب استاد کی یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے نوجوان طلبہ کا ربط وتعلق شخصیات کے بجائے افکار ونظریات سے قائم کرنے میں کامیاب ہوتا ہے۔

یہ کامیاب مدرس اچھی طرح سمجھتا ہے کہ اگر وہ اپنے نوجوان طلبہ کی بات اچھی طرح سنے گا تو وہ بھی اس کی بات پوری توجہ سے سنیں گے، وہ سمجھتا ہے کہ احترام کرنے سے احترام ملتا

ہے، جوادب کرتا ہے اس کا ادب کیا جاتا ہے، یہ کامیاب مدرس ان نوجوان طلبہ کو یہ احساس دلانے کی کوشش کرتا ہے کہ ان کی بات توجہ سے سنی جائے یہ ان کا حق ہے، اس طرح یہ طلبہ خود بخود یہ سیکھ لیتے ہیں کہ استاد کا حق ہے کہ اس کی بات توجہ سے سنی جائے۔

یہی معاملہ والدین کا ہے، یہ بہت سادہ سی فطری بات ہے کہ دو نسلوں کے درمیان باہمی مفاہمت (Understanding) میں کمی ہو، یہ کمی درحقیقت زندگی کے متعلق دونوں کی آراء کے مختلف ہونے سے نہیں پیدا ہوتی، بلکہ اس کا اصل سبب دونوں کا ایک دوسرے کی رائے اور نقطۂ نظر کا احترام نہ کرنا ہوتا ہے، یہ مسئلہ اس حد تک پیچیدہ ہوتا ہے کہ دونوں میں سے کوئی دوسرے کی رائے کو اچھی طرح سنتا بھی نہیں ہے، چنانچہ بسا اوقات ابھی ایک کے منہ سے کچھ الفاظ ہی نکلے ہوتے ہیں بات پوری ہونا تو درکنار کہ دوسرا فوراً بول پڑتا ہے، آوازیں بلند ہونے لگتی ہیں، اور پھر ہر فریق اپنے نقطۂ نظر کا دفاع کرتا ہے، کبھی کبھی ابتدا میں نظریہ میں شدت نہیں ہوتی لیکن بحث وتکرار کے سبب اس نظریہ میں ایسی شدت پیدا ہوتی ہے کہ پھر مرتے دم تک وہ نظریہ نہیں چھوڑتا بلکہ اسی شدت کے ساتھ اس کا دفاع کرتا رہتا ہے، اس صورت حال میں دونوں فریق کے لیے انتہائی مشکل ہوتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کو گفتگو کا موقع دیں، اظہارِ رائے کی آزادی دیں، کیونکہ دونوں اس کو ذلت اور خودسپردگی سمجھ رہے ہوتے ہیں، یہ نظریات کی جنگ مسلسل جاری رہتی ہے، درمیان میں کچھ پُرسکون لمحات آتے ہیں، کچھ وقت مصالحت کے ساتھ گزرتا ہے مگر زیادہ دیر تک یہ سکون باقی نہیں رہتا، بلکہ پہلے سے زیادہ تند وتیز لفظی جنگ شروع ہوجاتی ہے اور دونوں فریق میں کشیدگی اور زیادہ بڑھ جاتی ہے۔

جب کبھی والدین اور نوعمر بچوں کے درمیان اس طرح کی صورت حال (Situation) پیدا ہو تو والدین کو چاہیے کہ وہ اپنے برتاؤ اور اپنے تعامل اور اقدامات (Actions) کا جائزہ لیں، وہ سوچیں کہ جس بچے کے ساتھ یہ سب اختلافات اور بحث وتکرار ہونا ہی نہ چاہیے تھا، کیا اس کے ساتھ اس لفظی جنگ میں والدین کو فتح وغلبہ کی ضرورت تھی، جبکہ یہ بھی اچھی طرح واضح ہے کہ ابھی اس نوجوان کو اپنے والد کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کے لیے مزید معلومات وتجربات کی ضرورت ہے، دراصل نوعمر بچے کے ساتھ آپ کو ذرا مختلف انداز میں گفتگو کرنی ہوگی، مثلاً آپ اس سے گفتگو کرتے ہوئے یوں کہیں:

- ''ہاں! تمہارا یہ نظریہ اچھا ہے مگر میری اس معاملہ میں یہ رائے ہے''۔
- ''ایسا لگتا ہے کہ ہم کو اس پر اتفاق کرلینا چاہیے کہ اس مسئلہ میں ہم دونوں کی آراء مختلف ہیں''۔
- ''اس میں کوئی حرج نہیں کہ اس موضوع پر ہم میں سے ہر ایک کی رائے مختلف ہو''۔
- میں اس کو اس نظر سے نہیں دیکھتا جس نظر سے تم دیکھتے ہو، اور بے شک یہ تمہارا حق ہے''۔

اگر نوجوان کو مخاطب کرنے کا صحیح طریقہ استعمال کیا جائے گا تو آپ دیکھیں گے بہت جلدی وہ بھی اسی اسلوب میں گفتگو شروع کردے گا اور اسی طرح کی تعبیرات استعمال کرنے لگے گا اور اسے یہ بھی ادراک ہوجائے گا کہ والدین کو بھی اپنی الگ رائے رکھنے کا حق ہے، باہمی گفتگو اور تبادلۂ خیال کسی کے نقطۂ نظر کا اعتراف کرنے کے لیے بہت مفید ہے، اسی طرح کسی فکر و خیال کی وضاحت کے لیے اور اس کی گہرائی تک پہنچنے کے لیے اس کی بڑی اہمیت ہے، صرف اپنے نظریہ کو دوسرے فریق پر تھوپنے سے بہتر ہے کہ باہمی گفتگو کی جائے، اس سے عنفوان شباب کی دہلیز پر قدم رکھنے والا بچہ یہ سیکھے گا کہ لوگوں کے نقطہائے نظر کے مختلف ہونے میں کوئی حرج نہیں ہے، سب کے سب انسان ہیں، اس لیے اگر کسی کی رائے سے نقصان ہو یا کسی کو اپنی رائے سے رجوع کرنا پڑے تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، کیونکہ تمام افراد بشر

کا دنیا اور زندگی کو دیکھنے کا زاویہ نگاہ مختلف ہے۔

نوعمری کی مزاجی کیفیات و نفسیات:

عنفوان شباب میں جسم میں ہارمون (Harmon) کی تبدیلی ہوتی ہے، اس تبدیلی کے سبب نوجوان مختلف نوعیت کے جذبات واحساسات سے بار بار دوچار ہوتا ہے، اس کے اندر احساس کی شدت ہے، وہ جلدی متاثر ہوتا ہے، جذبات کا دباؤ جلدی قبول کرتا ہے لیکن اس کے باوجود وہ اپنے اعصاب اور اپنی ''جوانی'' کے احساسات کو چھپانے کی کوشش کرتا ہے، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ایک معمولی سبب کی بنیاد پر بھی اس کے مزاج میں برانگیختگی پیدا ہوتی ہے اور جذبات پھٹ پڑتے ہیں، چنانچہ عام طور پر نوجوان کے جذبات واحساسات میں شدت ہوتی ہے، وہ نفرت کرتے ہیں تو شدت سے کرتے ہیں اور محبت کرتے ہیں تو ٹوٹ کر کرتے ہیں، ان کا یہی حال دیگر امور میں ہوتا ہے، مثلاً امیدیں ٹوٹتی ہیں، مقصد پورا نہیں ہوتا یا کوئی نقصان ہوتا ہے تو ان کا احساس بہت شدید ہوتا ہے، گویا نوجوان کو جذبات و احساسات میں اعتدال سے واقفیت ہی نہیں ہوتی، اس صورت میں اگر اس کی کوشش کی جائے اور نوجوان پر دباؤ بنایا جائے کہ وہ اپنے جذبات واحساسات پر کنٹرول کریں تو نہ صرف اور شدت پیدا ہوگی بلکہ اس کے نتائج بھی برے ہی ہوں گے، شدتِ احساس کے ساتھ آپ کے دباؤ کے سبب وہ نوعمر بچہ یہ سوچے گا کہ آپ نہ صرف یہ کہ اس کو اور اس کے احساسات کو سمجھ نہیں رہے ہیں بلکہ آپ اس کو مزید پریشان کر رہے ہیں، کیونکہ آپ اس کو عین جذبات کے پریشر کے وقت جذبات پر قابو پانے اور ان احساسات سے چھٹکارا پانے کا دباؤ بنا رہے ہیں۔

عام طور پر ۱۷ر سال کی عمر کے بعد جذبات کی اس شدت میں کمی واقع ہونا شروع ہوتی ہے، کیونکہ اس مرحلہ میں ہارمونل تبدیلیوں (Harmonal changes) کی رفتار میں بھی آہستگی آجاتی ہے، اگر نوجوان کو یہ بات سمجھ میں آجائے کہ بڑے اس کے احساسات کو سمجھ رہے ہیں، اور بڑے بھی دور اندیشی کا ثبوت دیں تو پھر یہ مرحلہ بھی بغیر کسی مصیبت ومشکل اور آلام وشکایات کے گذر جائے گا، بلکہ اس کے سبب نوجوان کے اپنے والدین سے تعلقات میں مزید قوت وپختگی پیدا ہوگی، چونکہ بچہ دیکھے گا کہ والدین ہر موقع پر اس کے ساتھ کھڑے ہوتے ہیں اس لیے ان کے تئیں اس کے احترام میں بھی اضافہ ہوگا، اس کے برعکس اگر والدین بچے کی جذباتی کیفیات کو اس زاویہ سے دیکھیں گے کہ گویا یہ سب اس کی والدین کو پریشان کرنے اور ان کے ساتھ برا سلوک کرنے کی کوششیں ہیں، تو پھر عین شدتِ جذبات سے مغلوب ہونے کی حالت میں طرفین کے درمیان ایسی گفتگو ہوگی جس کے اثرات ونتائج منفی ہوں گے، جس کی یادیں تلخ ہوں گی، جس کا اثر آئندہ سب کے تعلقات پر پڑے گا۔

نوجوان کی اپنے ظاہری حلیہ کو لے کر پریشانی:

کبھی کبھی ہم بڑے یہ یاد کر کے ہنستے ہیں کہ جب ہم چھوٹے تھے تو لوگوں کے سامنے کس طرح آتے تھے اور ہماری ظاہری شکل کیسی ہوتی تھی، لیکن نوجوانوں کے لیے یہ مسئلہ ہنسی مذاق کا نہیں بلکہ بہت سنجیدہ مسئلہ ہوتا ہے، وہ دوسروں کے سامنے جانے کے لیے اپنے ظاہری حُلیے اور اپنی شکل کو سنوارنے کا بے حد اہتمام کرتے ہیں، نوجوان کے لیے اس کی ذاتی شناخت کی خاطر اس کا ظاہری حلیہ بہت اہم ہوتا ہے، چنانچہ روزانہ جب وہ آئینہ میں اپنی شکل دیکھتا ہے تو اپنی شکل اور اپنے چہرے میں رونما ہونے والی ان تمام تبدیلیوں کو بھی دیکھتا ہے کہ کس طرح اس کے جسم میں تبدیلی آرہی ہے اور وہ بچپن سے پختہ جوانی کے مرحلہ میں داخل ہو رہا ہے، چنانچہ وہ آئینہ میں جو کچھ دیکھتا ہے اور وہ صورت جسے لوگ دیکھتے ہیں اس کے سنوارنے پر بڑی توجہ دیتا ہے، چھوٹا بچہ بھی کبھی کبھی اپنی ظاہری شکل کو لے کر بہت پریشان ہو جاتا ہے، مگر اس کو اس

طرح اطمینان دلانا بہت آسان ہوتا ہے کہ ''جب تم بڑے ہوگے تو یہ چیز بدل جائے گی''، لیکن نوجوان جو پہلے ہی بڑا ہو چکا ہے اس کو اطمینان دلانا مشکل ہوتا ہے، اس لیے کہ اس کی اس وقت کی نئی شکل اس کے چہرے اور جسم کی وہ شکل وساخت ہے جو اب ہمیشہ باقی رہے گی، اس لیے اگر اس کو اپنی ظاہری صورت اچھی اور قابل اطمینان نہ لگی تو پھر اس کی زندگی اور اس کے خیالات کی دنیا میں ایک قیامت برپا ہوجاتی ہے، اس صورت حال میں بڑوں کو سب سے پہلے اس حقیقت کو قبول کرنا چاہیے کہ نوجوان اپنی ظاہری شکل کو لے کر بہت حساس ہوتے ہیں، اس سلسلے میں ان سے نہ ہی مذاق کرنا چاہیے، اور نہ ہنسنا چاہیے بلکہ اس کی پریشانی کو بانٹا جائے اور اس کی کوششوں کو سراہا جائے، بار بار اس کے سامنے یہ بات نہ دوہرائی جائے کہ اس کی پریشانی کی کوئی حقیقت اور کوئی بنیاد نہیں ہے۔

نوعمر لڑکوں کی اس طرح مدد کیجئے کہ ان کو سمجھائیے کہ جو اپنی کسی ظاہری شے کو لے کر پریشان ہوتا ہے اور پھر وہ اسے چھپانے کی کوشش کرتا ہے، تو اس کے چھپانے کی کوشش ہی دراصل دوسروں کو اس کی طرف متوجہ کردیتی ہے، مثلاً جس نوجوان کے چہرے پر مُہا سے نکل آتے ہیں وہ لوگوں سے ان کو چھپانے کی کوشش کرتا ہے، اور سامنے والے سے نظر نہیں ملاتا، اسی طرح وہ لڑکی جو محسوس کرتی ہے کہ اس کا ایک رخسار چھوٹا اور ایک بڑا ہے، تو وہ جب بھی بات کرتی ہے ایک ہاتھ ایک رخسار پر رکھ لیتی ہے، جس نوجوان کے چہرے کے کسی جانب کوئی داغ دھبہ ہو عام طور پر وہ لوگوں سے ملتے اور بات کرتے وقت اس جانب کو چھپا کر دوسری جانب کو سامنے رکھتا ہے، نوجوان بچے بچیاں ان طریقوں کو دراصل مفید اور مؤثر سمجھتے ہیں، حالانکہ اس سے ان کی ناکامی ظاہر ہوتی ہے۔

چنانچہ اگر آپ کا نوعمر بچہ ان میں سے کوئی بھی طریقہ اپناتا ہے تو آپ اس کو یہ بتانے میں بڑی احتیاط سے کام لیجئے کہ یہ طریقہ مفید نہیں ہے، اگر آپ نے یکا یک سے (ڈائریکٹ) یہ کہہ دیا کہ یہ حماقت ہے، تم یہ جو طریقہ اپنا رہے ہو یہ گھٹیا طریقہ ہے، تو وہ جذباتی ہوجائے گا اور پھٹ پڑے گا، اس سے اس کی پریشانی میں اضافہ بھی ہوگا، وہ اپنی شکل کے سلسلہ میں جس چیز کو لے کر پریشان ہے گویا آپ اسی کا مذاق بنا رہے ہیں، اس سے اس کی خود اعتمادی کو مزید ٹھیس پہنچے گی، پھر وہ اپنے اس عیب کے سبب پیدا ہونے والے منفی جذبات کی بھڑاس نکالنے کے بارے میں سوچے گا کہ وہ کسے پائے اور کس پر برس پڑے، بہت ممکن ہے کہ آپ ہی کو یہ قربانی دینی پڑے اور اس کی تنقیدوں کے حملے برداشت کرنا پڑے۔

جسمانی مظاہر کے اعتبار سے عام طور پر نوعمر بچوں کو جو شکوے ہوتے ہیں، ان کا تعلق اعضائے جسمانی کے چھوٹے ہونے یا بڑے ہونے سے ہوتا ہے، یا چہرے کے خدوخال سے ہوتا ہے، یا اعضائے جنس سے ہوتا ہے، اسی طرح بسا اوقات بچوں کو مہانسے (Pimples) اور بچیوں کو چہرے پر بال کا شکوہ ہوتا ہے۔

عام طور پر جس نوجوان کو زندگی کے عام مسائل میں کچھ خود اعتمادی حاصل ہوتی ہے وہ ان مظاہر سے بہت زیادہ پریشان نہیں ہوتا، البتہ اس کی پریشانی جس درجہ کی بھی ہو اس کو اس سلسلہ میں اپنے والدین سے بات کرنا چاہیے۔

آپ کے لیے اس طرح کے شکوؤں کو بہت آسانی سے دور کرنا ممکن ہے، آپ کو اس سلسلے میں طبی نقطۂ نظر اور امور صحت کا سہارا لینا پڑے گا، مثلاً اگر بچی کو اس کی شکایت ہے کہ اس کے چھاتی (Breast) چھوٹے ہیں، تو والدہ کو اسے سمجھانا پڑے گا کہ یہ کمزوری کی علامت نہیں، اس سے دودھ اور رضاعت یا کامیاب ازدواجی زندگی پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔

جہاں تک چہرے پر مہاسوں (Pimples) کا مسئلہ ہے تو یہ واقعی نوعمر لوگوں کے لیے بہت پریشان کن ہے، کیونکہ نوعمر بچے عام طور پر عمر کے اس مرحلہ میں دوسروں کے سامنے بہت مؤثر (Atractive) انداز میں سنور کر آنا چاہتے ہیں، اور یہی عمر ہوتی

ہے جس میں مہانسے چہرے کی حالت خراب کر دیتے ہیں، لیکن اس کے مختلف علاج بھی پائے جاتے ہیں، ان سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے اور ساتھ ہی اس کو تیل مسالے کی چیزوں سے پرہیز کی ہدایت دی جاسکتی ہے، اسی طرح اس کو بتایا جاسکتا ہے کہ وہ بہت زیادہ نفسیاتی تناؤ اور پریشانی سے بچے کھلی تازہ اور صاف ہوا میں زیادہ رہنے کی کوشش کرے، بنیادی چیز یہ ہے کہ نوجوانی کے مرحلہ میں ہارمون کے تغیرات کے سبب مہانسے نکلتے ہیں، عام طور پر جب ہارمون استقرار کی حالت میں پہنچ جاتے ہیں تو مہانسے بھی خود بخود ختم ہوجاتے ہیں۔

نوعمروں کو صفائی ستھرائی، پاکیزگی وطہارت اور خاص طور پر اس کی تلقین کرنا چاہیے کہ ان کے جسم سے مکروہ بو نہ آئے بلکہ اچھی بو آئے، اس لیے کہ انسان عام طور پر اپنے جسم سے اٹھنے والی بو نہیں محسوس کر پاتا باوجود اس کے کہ وہ دوسروں کی بو سونگھنے پر قادر بلکہ حساس ہوتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ نوعمر بچے جب جب اپنی حالت کو بہتر اور اپنے ظاہر کو اچھا پاتے ہیں تو خود بخود زندگی کے تئیں ان کا نقطۂ نظر بہتر ہو جاتا ہے، اس لیے کوشش یہ کرنا چاہیے کہ نوجوان اپنی شکل وصورت اور اپنے ظاہر کو نہ صرف قبول کریں بلکہ وہ خود اس کی قدر بھی کریں، ان کو بتانا چاہیے کہ ہر انسان خواہ اس کو کسی قدر خود اعتمادی حاصل ہو وہ اپنے ظاہر کو لے کر فکر مند ہوتا ہے خاص طور پر نوعمری کے مرحلہ میں، اور عام لوگوں کی جسمانی ساخت اور ظاہری شکل میں کچھ نہ کچھ ایسا ضرور ہوتا ہے جس سے وہ پوری طرح مطمئن نہیں ہو پاتے، اس کو اس حقیقت سے بھی واقف کرانا چاہیے کہ بعض چیزیں وہ ہوتی ہیں جن پر ہم خود تو غور کرتے ہیں مگر دوسرے اس کو محسوس نہیں کرتے، اور پھر انسان کے لیے اس کی ظاہری شکل وصورت ہی سب کچھ نہیں ہوتی اصل تو اس کے اندر چھپا ہوا جوہر ہوتا ہے۔

بہت زیادہ شرمانا:

شرم سے یہاں ہم صرف حیا مراد نہیں لے رہے ہیں، اس لیے کہ حیا تو انسان کے اوصاف حمیدہ میں شمار ہوتی ہے، بلکہ اس سے ہماری مراد حد سے زیادہ شرم اور شدید ہچکچاہٹ (Hesitation) ہے، جو کہ نوعمری میں بچوں کے مختلف انداز (Attitude) سے ظاہر ہوتی ہے، جس کا سبب کبھی یہ ہوتا ہے کہ اس کے آس پاس اس کے قریبی دوست نہیں ہوتے، یا وہ لوگوں میں رہنے اور گھلنے ملنے کے بجائے خلوت وتنہائی کی طرف زیادہ مائل ہوتا ہے، یا غیر فطری طور پر پڑھائی اور اسکول کے کاموں پر زیادہ دھیان دیتا ہے، یا وہ مبالغہ کی حد تک اپنے ہم عمروں سے الگ تھلگ رہنا پسند کرتا ہے، دوسروں کے سامنے جانے سے بہت زیادہ بچتا ہے، یا اس کے اندر گفتگو کی قدرت کم ہوتی ہے، وہ لوگوں کے سامنے حتی کہ جن لوگوں سے وہ واقف ہوتا ہے ان کے سامنے بھی اپنا دفاع نہیں کر پاتا، اس کے علاوہ اور بھی ایسے رویّے ہوتے ہیں جن سے اس کی شرم اور الجھن کا اندازہ ہوتا ہے۔

عام طور پر نوعمروں میں بہت زیادہ شرم کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ بڑوں کے مزاج سے صحیح طور پر واقف نہیں ہوتے، اس لیے اکثریت اس سے تب ہی نجات پاتی ہے جب وہ اس مرحلہ سے نکل کر پختہ عمر میں پہنچ جاتی ہے، البتہ اگر ضرورت سے زیادہ شرم ہو تو پھر یہ آگے بھی باقی رہتی ہے، اس کے تسلسل کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ نوعمری کے مرحلہ میں اس نوعمر بچے کو اس کی بہت زیادہ ضرورت تھی کہ وہ دوسروں سے گھلتا ملتا، ان سے تبادلہ خیال کرتا، ان کے تجربات سے فائدہ اٹھاتا، مگر وہ اپنی شرم کے باعث ایسا نہ کر سکا، چنانچہ وہ اپنے مزاج وافکار سے بھی واقف نہ ہوسکا، کیونکہ اس نے کبھی اس کو بیان ہی نہیں کیا اور لوگوں کے سامنے ظاہر ہی نہیں کیا، اسی وجہ سے اس کی شرم میں اور اضافہ ہوگیا اور اس کی مدت بھی طویل ہوگئی۔

اس شرم کے باعث نوعمر بچوں میں دوسروں پر توجہ نہ دینے

اور لاپروائی برتنے کی عادت پیدا ہوجاتی ہے، بلکہ بسا اوقات دوسروں کے تئیں سرکشی پیدا ہوجاتی ہے، پھر آپ دیکھیں گے کہ اس سے جو بھی بات کرتا ہے تو وہ اس پر غصہ ہوتا ہے اور جذباتی ہو جاتا ہے، اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اس کو امن واستقرار کا شعور نہیں ہوتا، وہ اپنے گرد وپیش کی دنیا کو بہت بھیانک و پرخطر تصور کرتا ہے، اسی لیے وہ عام طور پر لوگوں سے کنارہ کشی اور خلوت کو ترجیح دیتا ہے، اسی لیے پھر بہت سی چیزیں اس کے سامنے اپنی حقیقت پر دلالت نہیں کرتیں، سرکشی کے پیچھے خوف و بے امنی اور بے اطمینانی کی نفسیات چھپی ہوتی ہیں، لوگوں کے ساتھ اس کے نہ ملنے جلنے اور بے رخی برتنے بلکہ لوگوں سے اس کے بے اعتنائی برتنے کے پیچھے درحقیقت لوگوں سے اس کے گھلنے ملنے کی شدید ضرورت مخفی ہوتی ہے، اس لیے اس کو اس کے حال پر چھوڑا بھی نہیں جاسکتا، البتہ اگر اس صورت حال میں آپ نے اچانک اس سے یہ سوچ کر کہ ''آپ نوجوان کی اندرونی کیفیت اور اس کے عوارض واسباب سے خود اس سے زیادہ واقف ہیں'' کچھ کہہ دیا، تو اس حالت میں آپ جو بھی کہیں گے وہ اس کا انکار کرے گا، کیونکہ دراصل وہ خود بھی اپنے خیالات و جذبات کی کیفیت و حقیقت سے واقف نہیں ہوتا، آپ تو فقط اس کا مشاہدہ کیجئے کہ جب وہ دوسروں کے ساتھ ہوتا ہے تو مطمئن اور خوش نہیں ہوتا، پس اگر آپ کے لیے ممکن ہو تو کوشش کیجئے کہ آپ اس کے دوسروں سے میل جول پر اس کی حوصلہ افزائی کیجئے، یہاں یہ ذکر کردینا بھی ضروری ہے کہ بہت سے نوعمر بچے اپنی پریشانی و بے چینی کو چھپانے کے حریص ہوتے ہیں بلکہ بسا اوقات وہ خود سے بھی مخفی رکھنا چاہتے ہیں، اسی وجہ سے وہ آپ سے اور دیگر لوگوں سے بات کرنے میں پریشانی کا سامنا کرتے ہیں، اس لیے آپ کی کوشش یہ ہونی چاہیے کہ بالواسطہ (Indirect way) اپنا کردار ادا کریں، کیونکہ بلاواسطہ (Direct) آپ کی مداخلت مفید نہیں ہوگی۔

نوعمر بچوں کو شرم وجھجک اور خلوت کی نفسیات سے باہر نکالنا آسان کام نہیں ہے، مگر معاملہ خواہ کسی قدر سنگین ہو پھر بھی اس کو ایسے کام کرنے پر مجبور نہیں کرنا چاہیے جن کو کرنے میں وہ شرماتا ہے یا جن کو بآسانی اور بخوشی وہ انجام نہیں دے پاتا، کیوں کہ اگر اسے مجبور کیا گیا تو اس پر منفی اثرات پڑیں گے وہ مزید کنارہ کشی اور خلوت کو ترجیح دینے لگے گا، آپ اس کو یہ احساس دلانے سے بھی گریز کیجئے کہ اس میں جو عادت ہے وہ اچھی نہیں، یا اس کے اندر کوئی خلل ہے، یا اس کو کسی چیز کی ضرورت ہے، کیونکہ ان چیزوں سے اس کے تردد، عدم استقرار اور خود پر بے اعتمادی میں مزید اضافہ ہوگا، اس کے برعکس آپ اس کو یہ احساس دلائیے کہ آپ اس پر اور اس کی صلاحیتوں پر اور جو کچھ وہ کرسکتا ہے اس پر اعتماد کرتے ہیں، ایسے وسائل کے بارے میں سوچیے جن کے ذریعہ اس کی دوسروں سے دوستی ہوسکے اور اس کے تعلقات بن سکیں، آپ اس کو یہ احساس دلانے کی کوشش کیجئے کہ وہ ایک با صلاحیت انسان ہے، اس کے اندر یکے بعد دیگرے کامیابیوں کے حصول کی صلاحیت ہے، اس کو ذمہ داریاں دیجئے، اپنے متعلق امور میں فیصلہ لینے کی اسے آزادی دیجئے، دیگر معاملات میں اس سے مشورہ کیجئے، اس کی رائے لیجئے، یہ سب کیجئے مگر دن دو دن میں کسی بڑی تبدیلی کی توقع ہرگز مت کیجئے۔

عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ بعض مرتبہ شرم کے مواقع پر بہت سے نوعمر بچوں کا چہرہ غیر ارادی طور پر مارے شرم کے سرخ ہوجاتا ہے، بعض مرتبہ یہ مشکل کسی کسی میں اس حد تک ہوتی ہے کہ وہ اس کے معاشرتی برتاؤ پر بہت اثر انداز ہوتی ہے۔ ایسا بالعموم فطری طور پر جسمانی تبدیلیوں کی وجہ سے ہوتا ہے، اس موقع پر نوجوان کو یہ سمجھانا چاہیے کہ آپ جس قدر اس پر قابو پانے کی کوشش کریں گے اسی قدر اس میں اضافہ ہوگا، اس لیے بہتر یہ ہوگا آپ اس پر توجہ ہی نہ دیں۔

تاریخ کے جھروکوں سے

''ہندوستان کے عہد ماضی میں
مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری-جلد سوم'' ایک مطالعہ
(مصنفہ سید صباح الدین عبدالرحمٰنؒ)

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی

☆☆☆

''ہندوستان کے عہد ماضی میں مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری'' کی تیسری جلد جو ۳۲۳ صفحات پر مشتمل ہے، اس میں مغل شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کی حکومت کے احوال، اس کی رواداری وفراخدلی کو پیش کیا گیا ہے، اس پر لگائے جانے والے الزامات کا محاکمہ کرنے اور منصفانہ جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے، مصنف نے اس جلد کے اکثر حصے کو بلکہ تقریباً پوری جلد کو اورنگ زیب کے لئے غالباً اس لیے مختص کیا کیونکہ اورنگ زیب کی مدت حکمرانی بھی طویل ہے اور اس کا عہد مختلف حیثیتوں سے ممتاز بھی ہے، اس میں شبہ نہیں کہ اس کو ایک آئیڈیل حکمراں کی حیثیت سے تسلیم کیا جاتا ہے، انگریزوں نے ہندوؤں کا دل موہنے اور اپنی سرکار کو ان کے لیے باعث رحمت باور کرانے کی خاطر مسلم حکمرانوں کو بہت مبغوض وظالم وبنا کر پیش کیا جس میں وہ کامیاب رہے، اس کام کے لئے سب سے زیادہ انھوں نے اورنگ زیب کو ہدف بنایا، پھر ان کو ہندو مؤرخین میں سے بھی بعض ایسے لوگ ہاتھ آئے جنہوں نے ان کا کام آسان کر دیا، ان مورخین میں سر فہرست جدوناتھ سرکار ہیں جنھوں نے ہسٹری آف اورنگ زیب کی پانچ جلدیں لکھ ڈالیں، اس کتاب کے مصنف مرحوم صباح الدین عبدالرحمٰن نے کتاب کی ابتدا طویل دیباچہ سے کی ہے جس میں انھوں نے جدوناتھ سرکار کا اچھا خاصہ محاکمہ کیا ہے اور ان کے تضادات کو ان ہی کی دوسری کتاب فال آف مغل امپائر کی روشنی میں پیش کیا ہے، بلکہ یوں کہنا چاہے کہ یہ پوری جلد جدوناتھ سرکار کی اورنگ زیب پر لکھی گئی پانچ جلدوں کا مورخانہ جائزہ اور ناقدانہ تجزیہ ہے، تو بے جا نہ ہوگا، مصنف کے مطابق جدو ناتھ سرکار کی اورنگ زیب پر کتاب نے انگریزوں کی منشاء پوری کی، انھیں اس کا بھرپور معاوضہ بھی ملا، اس وقت تو یہ محسوس کیا گیا کہ یہ اعزازات ان کی مورخانہ تحقیقات کا صلہ ہیں مگر اس کے دوررس اور مضر نتائج نے صاد کیا کہ نہیں وہ اعزازات انگریزوں کی دلی مراد پوری کرنے کا بدلہ تھے، مصنف کی اس رائے پر حیرت زدہ ہونے کی ضرورت نہیں اس لیے کہ یہ امر کوئی تعجب خیز نہیں، اگر نوبل انعام یافتہ لوگوں کو نوبل انعام دینے کے اسباب کا منصفانہ جائزہ لیا جائے تو اسلام دشمنی اور مسلم دشمنی کی تاریخ پر نوبل انعام کے حوالے سے ایک بہترین کتاب مرتب ہوسکتی ہے، فکر اسلامی کی بیخ کنی، اسلام کے صحیح تصور سے بغاوت، اسلام کی امریکی تشریح، مسلم دشمنی جیسے عناصر کے حامل متعدد افراد نوبل انعام یافتہ ہوئے ہیں۔

مصنف نے ان کی کتاب کے بدترین نتائج کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''جدوناتھ سرکار نے اورنگ زیب کی تاریخ جس محنت ، دیدہ ریزی ، بلکہ دیدہ وری سے لکھی ہے اس کی داد ان کو ملتی رہی ،مگر جس مقصد کی خاطر یہ تحقیقی کارنامے انجام دیے گئے وہ بھی اچھی طرح پورا ہوا ،مگر اس کے ساتھ اس کے دور رس نتائج مضر بھی ثابت ہوئے ، برطانوی حکومت کے زمانہ میں ہندؤں اور مسلمانوں کے تعلقات میں جو ناخوشگواری بلکہ ایک دوسرے سے جو بیزاری پیدا ہوئی اس کی آگ میں جدوناتھ سرکار کی یہ جلدیں تیل چھڑکتی رہیں ،موجودہ دور کی قومی یکجہتی اور جذباتی ہم آہنگی میں جو رکاوٹ ہورہی ہے اس میں اس قسم کے تاریخی لٹریچر کو بھی بڑا دخل ہے''۔(ص۹)

اس کتاب کے ذریعہ اورنگ زیب کی جو تصویر بنائی گئی اور اس پر جو الزامات عائد کیے گئے اس کا خلاصہ پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جدوناتھ نے ان جلدوں میں بڑے طاقتور طریقے سے یہ دکھایا ہے کہ اورنگ زیب کے خلاف راجپوت حب الوطنی کے جذبات سے سرشار ہوکر لڑتے رہے ، اسی طرح شیواجی کی رہنمائی میں اورنگ زیب کے خلاف مرہٹوں کی لڑائیاں اس لیے ہوتی رہیں کہ وہ چاہتے تھے کہ ان کے فادر لینڈ میں ایک غیر ملکی اور سامراجی حکومت کے بجائے قومی حکومت ہو، اس سلسلہ میں مغلوں کی حکومت کو قزاقی بھی کہہ گئے ہیں اور اورنگ زیب کو بدترین حکمراں ثابت کرنے کی کوشش میں اس کو راون ،ناشکرگزار آقا،ظالم،دغاباز اور جھوٹا، ہندوؤں کے مندروں کا مسمار کرنے والا ، ہندؤں کو تمام ملازمتوں سے محروم رکھنے والا ، زبردستی اسلام قبول کرانے والا وغیرہ ثابت کرکے دکھایا ہے''۔(۹۔۱۰)

''جدوناتھ سرکار پر یہ الزام آتا ہے کہ انہوں نے ایک مؤرخ کے بجائے متعصب اور غیر روادار ہندو بن کر اپنی یہ جلدیں لکھی ہیں، ہندو بن کر اورنگ زیب کا مطالعہ کرنا کوئی قابل اعتراض بات نہیں ،مگر ان کی فال آف دی مغل امپائر کی چار جلدوں کا مطالعہ کرنے کے بعد ان کے متعلق کچھ اور رائے قائم کرنی پڑتی ہے، ہسٹری آف اورنگ زیب میں تو راجپوت بہت بڑے محبّ وطن اور دوست نظر آتے ہیں مگر فال آف دی مغل امپائر میں ان ہی راجپوتوں کا کردار اس رنگ میں دکھایا گیا ہے کہ محض جاگیر کی خاطر باپ بیٹے کو اور بیٹا باپ کو قتل کر دیتا ،عورتیں اپنے وفادار رشتہ دار کو زہر دے دیتیں ، راجہ اپنے وزراء کو مار ڈالتے اور دیوتا رام کی یہ نسل اپنے گھریلو جھگڑوں کو نپٹانے کے لیے بیرونی ڈاکوؤں سے بھی مدد لے لیتی ، راجپوتوں کی کردار نگاری کرتے ہوئے یہ بھی لکھتے ہیں کہ دہلی کی سلطنت کے خاتمہ کے بعد راجہ کے استھان کی یہ بہادر نسل بڑی مایوس کن مصیبت میں مبتلا ہوگئی، اس کی سیاست میں گھن لگ گیا''(ص۱۰)

مصنف نے دیباچہ میں جدوناتھ سرکار کی تضاد بیانی کا ان کی دونوں تصنیفات کی روشنی میں اچھا جائزہ پیش کیا ہے، اس طویل بحث کی ابتدائی سطریں ہم یہاں نقل کیے دیتے ہیں:

''اس قسم کی تضاد بیانی سے ان کی پوری کتاب بھری ہوئی ہے،ان کا جب جو جی چاہتا ہے لکھ جاتے ہیں اور ان کو خبر نہیں ہوتی ہے کہ پہلے جو کچھ کہہ چکے ہیں اسکی تردید ہورہی ہے''۔(ص۲۴)

مصنف نے جدوناتھ کی تحریروں کی تردید کے لئے ان کے معاصر مورخین کی شہادتیں بھی نقل کی ہیں اور ان کے ذریعہ ان کی تاریخی بد دیانتی، مذہبی تعصب اور عدم رواداری کو کھول کر رکھ دیا ہے، دیباچہ کے اختتام پر اپنی اس عرق ریزی کا لب لباب پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''آخر میں پھر یہ کہنا ہے کہ ہندؤں نے شیواجی کو اپنا ہیرو تسلیم کیا ہے تو کسی مسلمان اہل قلم کے لیے یہ زیبا نہیں کہ اپنی تکلف دہ تحریروں سے ان کو مجبور کرے کہ وہ اس کو اپنا ہیرو نہ مانیں، اسی طرح مسلمانوں نے اورنگ زیب کو اپنا آئیڈیل حکمراں مان لیا ہے تو کسی ہندو مؤرخ یا اہل قلم کے لیے مناسب نہیں کہ اس کو ایسا بدترین حکمراں ثابت کرے کہ اس سے بدتر تصور نہیں کیا جا سکتا

ہے، اگر کوئی مسلمان یا ہندو اس قسم کی کوشش کرتا ہے تو وہ اپنے مذہبی تعصب اور غیر رواداری کا ثبوت دیتا ہے، تاریخ کے کچھ فیصلے اٹل اور بے رحمانہ ہوتے ہیں جن کو تسلیم کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا، مگر اورنگ زیب اور شیواجی پر تبصرہ کرتے وقت کوئی ان کے مذہب کو مطعون کرے تو پھر یہ اشتعال انگیزی ہوگی جس کا برا اور سخت ردعمل ہونا بھی لازمی ہے اور یہ ملک کی قومی یکجہتی کے لیے مضر ہے۔ اگر دلوں میں انسانی محبت اور پیار کا امرت ہو تو پھر رواداری کی جوت خود بخود جاگ اٹھتی ہے جس کے بعد غیب سے آواز آتی ہے کہ کوئی مذہب آپس میں بیر رکھنا نہیں سکھاتا'' (ص ۴۰)۔

کتاب کے ص ۴۱ سے <u>اورنگ زیب کی عظمت</u> کا بیان شروع ہوتا ہے، اس کی ابتدا اس حقیقت سے کی گئی ہے کہ ''اورنگ زیب کو عام طور پر مسلمان بہت اچھا اور ہندو بہت برا سمجھتے ہیں''، اس امر پر حیرت کا اظہار کیا گیا کہ ایک ہی ملک کے باشندوں کا بہت اچھا اور بہت برا سمجھنے کا معیار بھی علاحدہ ہے، مگر واقعہ یہ ہے کہ یہ امر قابل حیرت واستعجاب نہیں، ایسا ہونا عین ممکن ہے، مسلمانوں کا نقطۂ نظر پیش کرنے کے لئے ابتدا میں ہی مولانا شبلی جیسے ناقد اور دیدہ ور مورخ کا یہ نظریہ نقل کیا ہے ''کہ عام اسلامی دنیا میں اس کے بعد آج تک اس کے برابر کا شخص پیدا نہیں ہوا'' لیکن ہندو جس نظر سے دیکھتے ہیں اس کی ترجمانی کے لیے جدوناتھ سرکار کا بنایا ہوا مرقع پیش کیا ہے:

''قرآن کے نظام سیاست نے ان ہندوؤں کی زندگی کو جو راسخ العقیدہ مسلمان حکمرانوں کے زیر حکومت تھے، ناقابل برداشت بنادیا تھا، اس نظام سیاست کا بہترین نمونہ اورنگ زیب تھا، جس نے اپنی عدیم المثال اخلاقی سیرت اور مذہبی سرگرمی سے اس سیاست کو منطقیانہ تتمہ پر پہنچانا فرض سمجھا، اس نے ہندوؤں کے علوم وفنون کو منتشر کیا، ہندوؤں کی عبادت گاہوں کو منہدم کیا، ہندوؤں کے میلوں اور تہواروں کو روک دیا، ہندوؤں پر مالی بار کا اضافہ کیا، انہیں ہر لحاظ سے نیچا دکھایا، ان کو حکومت کی ملازمتوں سے محروم کردیا گیا، اورنگ زیب کے ماتحت جو ہندو تھے، وہ اپنے علوم وفنون سے بے خبر، مذہبی روایات سے بے گانہ، معاشرتی ارتباط سے نا آشنا ہوکر زندگی بسر کرسکتے تھے، دولت اور خود اعتمادی سے بھی جو مواقع اور آزادی کے نتائج تھے وہ محروم تھے، غرض کہ ان کی زندگی مستقل معاشرتی اور سیاسی مذلت ہوکر رہ گئی تھی''۔ (ص ۴۲۔۴۳)

صباح الدین صاحب نے ان کی دوسری تحریروں کو پیش کرنے کے بعد ان کی وہ تحریریں بھی نقل کی ہیں جس میں انھوں نے یہ لکھا ہے کہ مسلمان اورنگ زیب سے لے کر جدوناتھ کے زمانے تک اورنگ زیب کو اچھا ہی سمجھتے رہے، مصنف نے جدوناتھ سرکار کی ان تحریروں کو مورخانہ شان سے پرے محض تعصب ونفرت انگیزی پر محمول کیا ہے، اپنے اس دعوے کی دلیل کے لیے انھوں نے <u>جدوناتھ سرکار اور اسلام کا عنوان</u> قائم کیا ہے، اوران ہی کی تحریروں کے حوالوں سے یہ ثابت کیا ہے کہ جدوناتھ سرکار نے غیر مستند حوالوں کے ذریعہ اورنگ زیب کی آڑ میں ''اسلام اور اسلامی تاریخ کو بھی بدنام اور مسخ کرنے کا مصمم ارادہ کرلیا تھا''، <u>انہدام مندر اور جدوناتھ سرکار</u> کے عنوان سے مصنف نے ان کی فرقہ وارانہ ذہنیت کو واضح کیا ہے، <u>راجپوت راجکماریاں اور جادوناتھ سرکار</u> کے تحت ان کی زہر آلود تحریروں پر تبصرہ کیا ہے، گزشتہ سطروں میں اکبر وجہانگیر کی راجپوتوں سے رشتہ داری اور ان کے ساتھ رواداری میں حد سے آگے نکلنے کا تذکرہ قارئین پڑھ آئے ہیں مگر ذرا جدوناتھ سرکار کی زہر میں بجھی ہوئی اس تحریر کو بھی پڑھ لیں:

''یہ راجکماریاں محل میں لائی جاتیں، ان کو ان کے مذہب سے محروم کردیا جاتا، اور مغل حرم کی بدنام زندگی بسر کرنے کو مجبور کیا جاتا، ان سے محبت تو نہیں کی جاتی، لیکن وہ اپنے آقا کی نفسانی خواہشوں کا کھلونا دو تین دن تک بنی رہتیں، پھر ایک لونڈی کی طرح بقیہ دن افسوس کے ساتھ گزارتیں اور ان کو معلوم

نہ ہوتا کہ بیوی کا رتبہ اور ماں بننے کی کیا خوشی ہوتی ہے ان کے لیے تو اپنے عزیز و اقارب کے ہاتھوں سے موت زیادہ شیریں ہوتی، بہ نسبت اس کے کہ ایک ایسی نسل (Race) کے ہاتھوں میں پڑ جاتیں جو مفتوحین سے فیاضی اور صنف نازک کے ساتھ فیاضانہ بہادری دکھانا مطلق نہیں جانتی تھیں''۔(ص۵۰۔۵۱)

اگر مصنف نے جدو ناتھ سرکار کی مورخانہ حیثیت پر سوالیہ نشان لگایا ہے تو کچھ غلط نہیں کیا، وہ اپنے تعصب میں اس حد سے گزر گئے کہ مغل امپائر کو قزاقی Brigandage سے تعبیر کر بیٹھے، انگریز نوازی اور انگریزوں کی مراد کو پورا کرنے کے لئے وہ ہندوستان کے مجاہدین آزادی کی قربانیوں سے یکسر چشم پوشی کرتے ہوئے یہاں تک لکھ گئے کہ ہندوستان کے لوگوں نے مغل دشمنی میں انگریزی حکومت کو آسانی سے قبول کرلیا:

''جن مؤرخوں کی آنکھیں تخت طاؤس اور تاج محل یا اسی طرح کی دوسری چیزوں کی ظاہری چمک دمک کو دیکھ کر خیرہ نہیں ہوتی ہیں ، ان کو مغلوں کا امپائر ایک قزاقی (Brigandage) معلوم ہوگا ، جس پر ایک مہین پردہ پڑا رہا، یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کے والیان ریاست اور یہاں کے لوگوں نے انگلستان کی حکومت کو آسانی سے قبول کر لیا''۔(ص۵۱)

مصنف نے **لوٹ مار اور جدو ناتھ سرکار** کے عنوان سے ان کی تحریروں کا محاکمہ کیا ہے اور واضح کیا ہے کہ انھوں نے لوٹ مار کو اورنگ زیب کی آڑ میں اسلام سے منسوب کرنے کی مذموم کوشش کی، پھر مرہٹوں کی تعریف میں جدو ناتھ کے قلم کی جولانیوں اور ان کے تضادات کا جائزہ لیا ہے، اس ضمن میں جس طرح جدو ناتھ سرکار نے شیواجی کی شخصیت کی مرقع آرائی میں تاریخ سازی کا ثبوت دیا ہے اس کو بھر پور انداز میں پیش کیا ہے، پھر **اورنگ زیب اور شمبھوجی** سے اورنگ زیب کے معاملات کا مورخانہ جائزہ لیا ہے اور جابجا اورنگ زیب کی رواداری کے واضح ثبوت پیش کیے ہیں، بعدازاں جدو ناتھ کی تحریروں سے ہی ثابت کیا ہے کہ **اورنگ زیب کے وفادار مرہٹے سردار** بھی رہے ہیں، مرہٹوں کے سارے خاندان اس کے خلاف برسرِ پیکار نہ تھے بلکہ ان میں سے متعدد اس کے وفادار بھی تھے، انھوں نے جدو ناتھ کے حوالوں سے ہی لکھا ہے کہ خود شیواجی کے اعزہ اقربا میں سے اس کے داماد، چچازاد بھائی بھتیجوں اور مشاہیر مرہٹہ سرداروں نے اورنگ زیب کا ساتھ دیا اور اورنگ زیب بھی ان کی قدر و منزلت کرتا رہا، ان کو مناصب اور دولت سے نوازتا رہا، ظاہر ہے کہ اورنگ زیب اور شیواجی کی جنگ کوئی مذہبی جنگ نہ تھی بلکہ ایک طرف ایک چھوٹے سے علاقہ پر اقتدار کی خواہش تھی تو دوسری طرف مغل امپائر کی حفاظت وو سعت کا جذبہ تھا، ظاہر ہے کہ اورنگ زیب مرہٹوں سے برسرِ پیکار ہونے کے باوجود جس طرح اپنے ساتھ آنے والوں کا اعزاز و اکرام کرتا رہا وہ اس کی فراخ دلی اور روادارانہ حکمت عملی تھی، جدو ناتھ سرکار نے اس کا اعتراف بھی کیا ہے مگر پھر بقلمِ خود اس پر پانی بھی پھیر دیا ہے، مصنف نے یہاں یہ بھی بحث کی ہے کہ اورنگ زیب مرہٹوں کو زیر کر سکا یا نہ کر سکا۔

اس بحث میں یہ بھی ذکر ہے کہ راجہ شاہو کو اورنگ زیب نے جدو ناتھ کے بیان کے مطابق اسلام قبول کرنے کو کہا مگر اس نے انکار کر دیا، اب اگر زبردستی مسلمان بنانے کا الزام اس پر صحیح ہوتا تو پھر وہ اس انکار پر کیوں کر راضی ہوتا، مگر تاریخ بتاتی ہے کہ ۱۷۰۳ء میں اس نے باقاعدہ اپنے زیرِ اہتمام اس کی شادی رستم راؤ کے لڑکے بہادر جی کی لڑکی سے کرائی، بہرحال اورنگ زیب نے مرہٹوں کو بھی زیر کیا وہ متحدہ ہندوستان کا تنہا فرما نروا تھا، اس نے ہندوستان کو جو وسعت دی وہ نہ اس سے پہلے تھی اور نہ اس کے بعد کبھی باقی رہ سکی۔

مصنف نے اس کے بعد **جدو ناتھ سرکار کی کردار نگاری** پر بحث کی ہے، انھوں نے لکھا ہے کہ:

''جدو ناتھ سرکار کو پورا اختیار تھا کہ وہ اپنے محبوب

ہیرو کی زندگی کے تاریک پہلوؤں کو نظر انداز کر کے اس کی مدح خوانی کریں اور اس پر فخر کریں، اسی طرح کوئی مؤرخ اورنگ زیب کو اپنا ممدوح بنالے اور اس کی زندگی کے تاریک پہلوؤں کو نظر انداز کر کے اس کی مدح خوانی کرے تو کیا اس کو یہ حق نہیں پہنچتا ہے''۔(ص ۱۰۷۔۱۰۸)

انھوں نے یہ بھی لکھا ہے:

''ایسے مسلمان فرماں روا پر ہر مسلمان کو اسی طرح فخر کرنے کا حق ہے جس طرح ہندوؤں کو شیواجی پر ناز ہے، مگر جدوناتھ سرکار نے اپنی'' ہسٹری آف اورنگ زیب'' کی پانچ جلدوں اور دوسری تحریروں میں اورنگ زیب کو دوسروں کی نظروں میں زیادہ سے زیادہ برا ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔

وہ اپنی تاریخ نویسی کے ماہرانہ انداز بیان سے اورنگ زیب کی زندگی کے ان روشن پہلوؤں کو نظر انداز نہیں کر سکتے تھے جن کا اعتراف معاصر تاریخوں میں کیا گیا ہے''۔(ص ۱۰۹)

اس ضمن میں مصنف نے اختصار ملحوظ رکھتے ہوئے کمالِ مہارت سے جدوناتھ سرکار کے اعترافات کو ان کی کتاب کے حوالوں کے ساتھ ملخص کیا ہے، جدوناتھ کے مطابق ایک بادشاہ میں جو خوبیاں ہونی چاہیں وہ سب اورنگ زیب میں موجود تھیِ ان کے مطابق اورنگ زیب نے جوزیر کی اور خاکساری شہزادگی کے زمانے میں دکھائی وہی بادشاہت کے دور میں بھی دکھاتا رہا، انھوں نے اس کی صلاحیتوں کا اعتراف کیا ہے، اس نے لکھا ہے کہ اورنگ زیب کی حکومت میں مغلوں کا ہلال بدر کامل ہوگیا، یہ بھی اعتراف کیا ہے کہ ہندوستان کی تاریخ میں اتنی بڑی ریاست کبھی قائم نہ ہوئی جتنی کی عہد عالمگیری میں ہوئی، حد یہ ہے کہ جدوناتھ نے اورنگ زیب کو مافوق البشر (Superman) اور آئیڈیل کیریکٹر بھی کہا ہے، مصنف نے چار صفحات میں جدوناتھ کے ان اعترافات کو پیش کیا ہے پھر یہ تعلیق کی ہے:

''اورنگ زیب سے متعلق جدوناتھ سرکار نے جو یہ سب کچھ لکھا ہے، اس سے اورنگ زیب کے آئیڈیل حکمراں ہونے کا ثبوت ملتا ہے لیکن وہ یہ سب کچھ لکھ کر جا بجا اپنی زہریلی رائے سے اس کی ساری خوبیوں کو زائل کر دینے کی کوشش کرتے ہیں''۔(ص ۱۱۳)

ان کی اسی طرح کی رائے کے متعلق مصنف لکھتے ہیں:

''اوپر کے اقتباسات میں اورنگ زیب کی حکمرانی کے کارناموں کو جو خراج عقیدت جدوناتھ سرکار نے پیش کیا ہے اس پر یہ لکھ کر کاری ضرب لگاتے ہیں کہ وہ کوئی عبقری نہ تھا، وہ کسی شعبہ کا نگراں تو ہوسکتا تھا مگر سیاست داں نہیں سمجھا جاسکتا، وہ مکمل طور پر سیاسی حیثیت سے ناکام رہا، وہ حکمراں کی حیثیت سے ایسا بدترین ثابت ہوا ہے کہ اس سے زیادہ کوئی اور بدتر تصور نہیں کیا جاسکتا''۔(ص ۱۱۴)

اس بحث کو مصنف نے کے اس مختصر جملے سے سمجھا جاسکتا ہے کہ ''جدوناتھ سرکار اورنگ زیب کی ہر اچھائی میں کوئی برائی کا پہلو نکال دیتے ہیں لیکن شیواجی کی ہر برائی میں اچھائی کا پہلو نمایاں کرنے کی کوشش کرتے ہیں''، مصنف نے آگے کئی صفحات میں جدوناتھ سرکا کے اقتباسات سے ان کے ذریعہ کی گئی اورنگ زیب کی متضاد کردار نگاری کے بڑے دلچسپ نمونے پیش کیے ہیں، جنھیں پڑھ کر حیرت بھی ہوتی ہے، ہنسی بھی آتی ہے اور سر پیٹ لینے کو دل چاہتا ہے، ان نمونوں کو پڑھ کر لگتا ہے کہ کہیں تو واقعی تاریخ نگاری کا فرض خود بخود ادا ہوگیا ہے مگر جب جب تعصب نے جوش مارا تو تاریخ نگاری تاریخ سازی میں تبدیل ہوگئی، اس طرح ان کی کتاب تاریخ کے نام پر بدنما داغ بن گئی، جس نے تاریخ، ملک اور ملک کی قدیم سنسکرتی کے تئیں خود ان کی وفاداری پر داغ لگا دیا، اس محاکمہ کو اختتام تک پہنچاتے ہوئے مصنف نے فیصلہ کن انداز میں بڑی اصولی بات لکھی ہے:

''تاریخ نویسی کی ایمانداری اور اسی کے ساتھ وطن دوستی کا تقاضا ہے کہ شیواجی اور اورنگ زیب دونوں کے کردار

کے روشن پہلوؤں کا غیر جانبدارانہ مطالعہ کیا جائے، اس کو ان کا ذاتی فعل اور عمل قرار دیا جائے، جدوناتھ سرکار اور ان کے ہمنوا مؤرخوں سے یہ شکایت بالکل بجا ہے کہ وہ اورنگ زیب کو برا کہتے کہتے اس کے مذہب کو بھی برا کہنے پر اتر آتے ہیں، اس میں ان کی مذہبی غیر رواداری اور تعصب کو زیادہ دخل ہے، کوئی مؤرخ شیواجی کو برا کہہ کر اس کے مذہب کو بھی برا کہنے لگے تو یہ بھی مذہبی غیر رواداری ہوگی، تاریخ کے عوامل وعواقب کے ساتھ جو تاریخی فیصلے ہو چکے ہیں ان کو اٹل سمجھ کر قبول کر لینے میں ہچکچانے کی ضرورت نہیں، خواہ وہ ہماری خواہش اور مرضی کے خلاف ہی کیوں نہ ہو"۔(ص۱۲۱)

مصنف نے اسکے بعد اورنگ زیب اور راجپوت کا عنوان قائم کیا ہے، انھوں نے لکھا ہے کہ اورنگ زیب کے بارے میں جدوناتھ نے یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ اس نے راجپوتوں کو ستایا، ان کی دلآزاری کی اور ان کے مذہبی جذبات کو ٹھیس پہنچائی، پھر انھوں نے اس تاثر کی تردید میں مدلل گفتگو کی ہے، مصنف لکھتے ہیں:

"جدوناتھ سرکار نے اورنگ زیب پر یہ الزام رکھا ہے کہ اس کے زمانہ میں ہندوؤں کی زندگی ناقابل برداشت تھی، ان کو ہر لحاظ سے نیچا دکھایا گیا، ان کو حکومت کی ملازمتوں سے محروم کر دیا گیا، وہ معاشرتی ارتباط سے ناآشنا ہو کر زندگی بسر کرتے تھے، اس الزام کی تردید موجودہ دور کے مسلمان مؤرخین کر چکے ہیں، مگر ہم اپنے ناظرین کو مغلوں کے عہد کی تاریخ کی مدد سے محض از سر نو یاد دلانے کی خاطر پہلے ان راجپوت اور ہندو منصب داروں کی فہرست ذیل میں درج کرتے ہیں جو عالمگیر کے دربار سے وابستہ رہے، پھر ہم جدوناتھ کی ہسٹری آف اورنگ زیب کی پانچ جلدوں ہی کی مدد سے یہ دکھانے کی کوشش کریں گے کہ راجپوت سردار کس طرح اورنگ زیب کے معاون بنے رہے اور کن کن عہدوں سے سرفراز کیے گئے، اس کے بعد خود جدوناتھ سرکار کی مؤرخانہ رواداری اور غیر رواداری کا موازنہ ہو جائے گا"۔(ص۱۲۳)

یہاں تقریبا ۶۴ راجپوت منصب داروں کا مصنف نے تعارف کرایا ہے اور لکھا ہے کہ اگر عالمگیر نامہ اور مآثر عالمگیری کا ٹھیک سے مطالعہ کیا جائے تو اور بھی نام ملیں گے، مصنف نے کمال مہارت سے ان ہندو سرداروں کی سرگرمیوں پر جدوناتھ سرکار کے حوالے سے ہی روشنی ڈالی ہے، انھوں نے واضح کیا ہے کہ اگر چہ راجپوت اورنگ زیب کے خلاف شجاع اور دارا شکوہ کی حمایت میں لڑے، جس کا فطری نتیجہ یہ ہونا چاہیے تھا کہ اورنگ زیب راجپوتوں کو دور رکھتا یا مشکوک نظروں سے دیکھتا تو اس پر کوئی تعجب بھی نہ ہوتا مگر جدوناتھ کی تحریروں سے ظاہر ہے کہ اس نے راجپوت فوجی سرداروں کے خلاف کوئی ناروا رویہ اختیار نہیں کیا، آگے مصنف نے جدوناتھ کے حوالے سے کچھ اور تفصیلات ذکر کی ہیں جن سے اورنگ زیب کی رواداری، اس کی شجاعت، راجپوتوں سے اس کے تعلقات، ہندو مسلم میں عدم تفریق پر روشنی پڑتی ہے، اس سلسلہ کا ایک اقتباس ملاحظہ کیجئے جو جدوناتھ کی چوتھی جلد کے حوالے سے مصنف نے لکھا ہے:

"راجپوت اورنگ زیب کی حمایت میں شیواجی اور مرہٹوں کے خلاف بھی لڑتے رہے، راجہ جے سنگھ نے جس ہوشمندی، جانبازی، پامردی اور کامیابی سے شیواجی کے خلاف جنگ کی، وہ اورنگ زیب کے عہد کی تاریخ کا ایک شاندار کارنامہ ہے، اس نے شیواجی کے بائیس قلعوں کو اورنگ زیب کے زیر نگیں کر دیا اور شیواجی کو اورنگ زیب کے دربار میں حاضر کر دیا، جب اس نے شیواجی کے خلاف پورندرا کے قلعہ کا محاصرہ کیا تو اس لڑائی میں مسلمان فوجی سرداروں کے ساتھ رائے سنگھ راٹھور، کیرت سنگھ مترسین، اندرامن بندیلہ، برن بھان، ادے بھان گوڑ، راجہ نرسنگھ گوڑ، کرن راٹھور، جگت سنگھ نراور، متر سنگھ راٹھور، راج سنگھ گوڑ، رول مل اور چتر بھوج چوہان وغیرہ نے بھی بڑی جوانمردی اور سپہ گری سے اس قلعہ کی تسخیر میں حصہ لیا جس

کے بعد شیواجی نے سپر ڈال دی‘‘۔(ص ۱۴۵)

اس کے بعد مصنف نے چھ صفحات میں جدو ناتھ سرکار کے مزید تضادات پر روشنی ڈالی ہے، مصنف نے تاریخ کے حوالے سے لکھا ہے کہ مغلوں اور راجپوتوں اور مرہٹوں کے درمیان ہوئی لڑائیاں محض ذاتی، علاقائی اور قبائلی مفادات کے لیے لڑی گئیں مگر راجپوتوں کی لڑائیوں کو جدو ناتھ نے حب الوطنی اور قومی لڑائیوں کا رنگ دینے کی کوشش کی ہے، مرہٹوں کی لڑائیوں کو فادر لینڈ کی آزادی کی لڑائیاں قرار دیا ہے، مغلوں اور مسلمانوں کو تو وہ غیر ملکی کہتے ہیں، بلکہ مغلیہ سلطنت کو انھوں نے قزاقی سے بھی تعبیر کیا ہے، مصنف نے ان کی رائے کے تضاد کو ظاہر کرنے کے لئے ان کا ایک طویل اقتباس نقل کیا ہے، جو انھوں نے مسلمانوں کے بارے میں لکھا ہے اس کو یہاں نقل کرنا ناگزیر معلوم ہوتا ہے، اس اقتباس کو پڑھ کر اندازہ ہوگا کہ جدو ناتھ سرکار خود اس کے قائل ہیں کہ مسلمان اپنی رواداری فراخ دلی اور وسعت نظری کی سبب یہاں کے لوگوں میں گھل مل گئے:

اس ملک میں ہندوؤں کی غالب آبادی کے درمیان اور ہندوستانی ماحول میں بودوباش سے بعض حیثیتوں سے مسلمان یہاں گھل مل گئے، وہ یہاں کی مقامی عورتوں سے شادی کرتے، ہندو مذہب اور بگڑے ہوئے بودھ مت کو چھوڑ کر جو مسلمان ہوئے ان کو انہوں نے اپنے معاشرہ میں مساویانہ جگہ دی، جس سے ان کا اصلی خون اور ان کی نسلی خصوصیات بھی جاتی رہیں، انہوں نے بہت سے ہندوانہ مراسم اختیار کر لیے، ان کے اعتقادات اور رہنے سہنے کے طریقے بھی ہندوانہ ہوگئے، اس طرح ازمنہ وسطی میں صوفی ازم اردو زبان اور انڈو مسلم آرٹ فاتحوں اور مفتوحوں کے مشترکہ سرمائے بن گئے، اور وہ کلچرل کے طریقے سے آپس میں مل گئے، گرچہ ذات پات کی دیواروں نے ان کو الگ رکھا، پھر ہندوؤں کی نیچی ذات والے مسلمانوں کے پیروں کی پرستش کرنے لگے اور جو ہندوؤں کی راسخ العقیدگی کے چمپین تھے، مثلاً شیواجی وہ بھی مشہور صوفی بزرگ کے معتقد ہوگئے، بنگال کے اور دوسرے صوبوں کے مسلمان کاشتکار جہاں اصلاح پسند ملا نہیں پہنچے، ہندوؤں کی طرح ان کے مذہبی تہواروں میں حصہ لیتے اسی طرح بہار کے نیچی ذات کے ہندو مسلمانوں ہی کی طرح محرم میں جوش وخروش سے شریک ہوتے، مقدس احکام اور سخت نظریات سے ہندو مسلمان ضرور علاحدہ رہے لیکن ان کی تقدیر مشترکہ ہوگئی تھی، ان کے رنج وغم میں بھی یکسانیت پیدا ہوگئی تھی اور وہ ہندوستان کے اندر ایک آفتاب کے نیچے رہ کر ایک دوسرے کے قریب تر ہوگئے تھے، ان میں کبھی کبھی خاص مذہبی قسم کے سلطان یا بادشاہ پیدا ہوجاتے‘‘۔(ص ۱۵۵۔۱۵۶)

اس بحث میں ان کے جا بجا متضاد تبصرے نقل کیے گئے ہیں، ان کے بعض ایسے اقتباسات نقل کیے گئے ہیں جن کو پڑھ کر لگتا ہے کہ غیر شعوری طور پر انھوں نے مغلوں کو خراج تحسین پیش کیا ہے، اسی لیے مصنف نے یہ سوال قائم کیا ہے۔

’’جدو ناتھ سرکار کے اس خراج تحسین سے مغلوں کی حکومت کیا قزاقی سمجھی جائے گی؟ اگر کوئی مؤرخ اس کو قزاقی قرار دے تو اس کی مؤرخانہ بصیرت کیا زیر بحث نہیں آئے گی؟‘‘(ص ۱۶۰)

۱۹۲۹ء میں جدو ناتھ نے جو مضمون اسلام ان انڈیا کے عنوان سے لکھا اس کے متعلق مصنف کا کہنا ہے کہ شاید ان کو اسلام پر اپنے ناروا حملوں کا احساس ہوگیا تھا اس مضمون میں انھوں نے اپنے غیر روادارانہ تعصب کو کم کرنے کی کوشش کی ہے، مصنف کے مطابق اس میں انھوں نے تفصیل سے مسلمانوں کے احسانات کو شمار کرایا ہے:

’’اب سوال یہ ہے کہ مسلمانوں نے اپنے عہد میں..... ہندوستان کو کیا کیا چیزیں دیں، ہمارے نزدیک یہ دس چیزیں ہیں:

۱۔ مسلمانوں نے ہندوستان کے تعلقات بیرونی دنیا سے قائم کرائے جس کی وجہ سے بحری جہازوں اور بحری تجارت کو از سر نو فروغ ہوا، ہندوستان میں چولا کی حکومت کے خاتمہ کے بعد یہ

دونوں چیزیں بالکل ختم ہوگئی تھیں۔

۲۔ہندوستان کے بیشتر علاقوں خصوصاً وندھیاچل کے شمال میں اندرونی طور پر امن وسکون قائم ہوا۔

۳۔ایک ہی قسم کے نظام حکومت سے تمام ملک میں یکسانیت پیدا ہوئی۔

۴۔مذہبی عقائد کے اختلاف کے باوجود اونچے طبقہ کے لوگوں کے عادات واطوار،لباس اور معاشرتی امور میں یک رنگی پیدا ہوئی۔

۵۔ہندی اور اسلامی طرز کا ایک آرٹ پیدا ہوا جس میں ہندوؤں اور چینیوں کے آرٹ کی بھی آمیزش تھی ،اس لیے تعمیرات میں ایک نیا اسٹائل پیدا ہوا اور عمدہ قسم کی صنعتوں کو فروغ ہوا،شال، کمخواب،قالین اور مرصع کاری اسی زمانہ کی یادگار ہیں۔

۶۔ایک مشترک زبان پیدا ہوئی جو ہندوستانی باریختہ کے نام سے مشہور ہوئی ،نثر نویسی میں ایک سرکاری اسٹائل کا رواج ہوا،جس کی بنا ان ہندو منشیوں نے ڈالی جو فارسی لکھا کرتے تھے اور اس اسٹائل کو مرہٹوں نے بھی اپنی زبان میں رائج کیا۔

۷۔دہلی حکومت کی وجہ سے جب امن اور اقتصادی خوش حالی بڑھی تو ملکی لٹریچر کو بھی ترقی ہوئی۔

۸۔مذہب میں توحید کے تصور کی تجدید ہوئی اور تصوف پھیلا۔

۹۔تاریخی لٹریچر پیدا ہوا۔

۱۰۔فنون جنگ اور تمدن کے عام شعبوں کو فروغ ہوا۔(ص۱۶۰۔۱۶۱)

بعد ازاں مصنف نے ہندوستان کے **بیرونی تعلقات** پر روشنی ڈالی ہے، ان کے مطابق بارہویں صدی میں جب مسلمانوں نے ہندوستان کو فتح کیا تو ہندوستان کے تعلقات بعض ایشائی اور افریقی ممالک سے قائم ہوئے، انھوں نے یکسانیت پر بھی گفتگو کی ہے، کہ مغلوں کے دوسو سالہ عہد حکومت میں یکساں نظام حکومت تمام صوبوں میں قائم تھا، سکّے یکساں تھے،مشترکہ زبان کا چلن ہوا، تمام صوبوں میں یکساں نظم ونسق قائم تھا،مصنف نے **زبانوں کی ترقی** پر بھی روشنی ڈالی ہے اور یہ واضح کیا ہے کہ مغلوں کے عہد حکومت میں سنسکرت، ہندی اور اردو کی کس طرح سرپرستی کی گئی، اس کے بعد انھوں نے **مذہب کے اثرات**، **تاریخی لٹریچر** اور **کلچرل اثرات** کے سلسلہ میں بحث کی ہے، انھوں نے صاف لکھا ہے کہ مسلمانوں نے چوں کہ ہندوستان پر صدیوں حکومت کی اس لیے یہاں کے لوگوں پر ان کے تمدنی اثرات وسیع پیمانے پر پڑے، یہ اثرات لباس، طعام، روزمرہ کی زندگی،تعمیرات، باغبانی اور فنون لطیفہ میں ہر جگہ دیکھے جاسکتے ہیں، **کاغذ** کا وجود مسلمانوں سے پہلے یہاں نہیں تھا،اس کو مسلمانوں نے ہی یہاں رواج دیا، یہ تمام مباحث مصنف نے جدوناتھ سرکار کے ہی حوالے سے لکھے ہیں اور آخر میں یہ سوال قائم کیا ہے کہ جب انھوں نے یہ سب لکھا ہے تو پھر ان کا یہ لکھنا کیوں کر صحیح قرار دیا جاسکتا ہے:

''مسلمانوں کا ایک خاص ذہن بن گیا ہے کہ جس کی بنا پر وہ لوٹ مار اور قتل کو خدا کی راہ میں انسانیت کا خالص ترین فعل سمجھنے کے عادی ہوگئے ہیں اور ایک مذہب جو اپنے پیروؤں کو ڈاکہ زنی اور قتل کو اپنا فریضہ سمجھنے کی تلقین کرتا ہو وہ انسانیت اور ترقی اور دنیا کے امن کا ساتھ نہیں دے سکتا ہے''۔(ص۱۶۸)

اس کے بعد مصنف نے جدوناتھ کے حوالے سے اورنگ زیب کے ذریعہ **مندروں کے انہدام** پر بحث کی ہے، انھوں نے لکھا ہے کہ جدوناتھ سرکار کا اورنگ زیب پر الزام ہے کہ اس نے بڑی بے دردی سے مندروں کو منہدم کیا،مصنف نے یہ بھی لکھا ہے کہ

''ان ہی کی تحریروں سے یہ بھی ظاہر ہے کہ جہاں کہیں مندر منہدم کیے گئے وہاں کے ہندو اور خصوصا راجپوت اتنے مشتعل نہیں ہوئے جتنے کہ جدوناتھ سرکار صدیوں کے بعد ہوئے ہیں''۔(ص۱۶۸)

(جاری.....)

تعارف و تبصرہ

نام کتاب: ''بچوں کی تربیت کے رہنما اصول''

تالیف: ڈاکٹر مامون مبیض

مترجم: ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی صاحب

صفحات: ۴۲۴

مطبوعہ: حجۃ الاسلام اکیڈمی، دیوبند ۲۰۱۹ء

قیمت: ۳۰۰/روپیے

تبصرہ نگار: محمد اصطفاء الحسن کاندھلوی

☆☆☆

تعلیم و تربیت کے میدان میں نفسیات کا لحاظ از بس ضروری ہے۔ آج کے ماہرینِ نفسیات وسماجیات کا تقریباً اس پر اتفاق ہے، اس سلسلہ میں عوامی آگہی بھی فی زمانہ جستہ جستہ پائی جارہی ہے، جوں جوں تحقیقات و انکشافات کے پردے کھلتے جارہے ہیں' عوام وخواص کو اس کی اہمیت کا اندازہ ہوتا جارہا ہے جو انتہائی خوش آئند ہے۔

یہ اک مسلمہ حقیقت ہے کہ بچوں کی تعلیم وتربیت' ان کی شخصیت کی تشکیل میں کلیدی اور بنیادی رول ادا کرتی ہے، والدین کا مزاج وکردار، اہلِ خاندان کے رسم ورواج اور اردگرد کا ماحول جس رنگ وآہنگ کا ہوتا ہے وہ حال کے کینواس پر آئندہ زمانہ میں ان کی شخصیت کی تصویر کشی کافی حد تک کردیتا ہے۔ نبی کریم علیہ الصلوۃ والتسلیم نے اس حقیقت کی طرف بہت پہلے اشارہ فرمادیا تھا، آپؐ کا فرمان ہے: ''ما من مولود الا یولد علی الفطرۃ، فابواہ یھودانہ او ینصرانہ او یمجسانہ'' (بخاری) کہ کوئی نوزائیدہ ایسا نہیں جو فطرتِ سلیمہ پر پیدا نہ ہو، والدین اس کو یہودی، عیسائی یا پارسی بنادیتے ہیں۔

بچوں کی تربیت کا مسئلہ دنیا کے حساس ترین مسائل میں سے ہے، اس کی حساسیت اور نزاکت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اگر والدین اور خانگی ماحول میں جھنجھلاہٹ، شدت پسندی، تنک مزاجی، بے حسی اور بے غیرتی وغیرہ کمزوریاں پائی جاتی ہیں تو وہ بچوں کے بھی طبیعت اور مزاج کا حصہ بن جاتی ہیں، اور اگر خدانخواستہ وہ فطری طور پر بھی اس قسم کی کمزوریوں کا حامل ہوتا ہے تو پھر نہلہ پر دہلہ۔ اور اسی کے نتیجہ میں ہمیں سماج میں بڑے بڑے سفاک، ظالم، بے درد اور بے رحم لوگ نظر آتے ہیں۔ اس کے برخلاف ایسے بچوں کو جو فطری طور پر شدت پسند و سفاک طبیعت کے مالک ہوتے ہیں' اگر خوشگوار، تہذیب یافتہ اور انسانیت سے بھرپور ماحول مہیا کریں تو ان کی فطرت کو قابو میں رکھنے میں بڑا مددگار ثابت ہوسکتا ہے۔ اللہ تعالی نے اسی لئے انسان کو انفرادی اور سماجی قوانین کا پابند بنایا ہے، جس کو 'اسلام' کا نام دیا گیا ہے، جو مختلف طبیعتوں اور فطرتوں کو اعتدال پر اور قابو میں رکھنے کا ایک بے مثال 'آلہ' ہے۔ انبیاء ومرسلین کو سماج وفرد کی اصلاح کے لئے باریٔ تعالی نے یہی آلہ عطا کیا' جس کا استعمال انھوں نے بخوبی کیا اور کامیاب رہے۔

اس ناحیہ سے اگر دیکھیں تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آلہ کے ذریعہ سماج کے ہر طبقہ کی تہذیب و تربیت کرکے ہمارے سامنے نمونہ پیش کیا ہے۔ آپؐ نے مردوں، عورتوں، بوڑھوں، جوانوں، بچوں، شہریوں اور دیہات کے رہنے والوں سب ہی کی تربیت کا کام انجام دیا اور آپؐ کے فیض وتربیت یافتہ لوگوں کو 'صحابہ' کا نام دیا گیا جو انسانی دنیا کی تاریخ میں بلاتفریقِ مذہب وملت اور بلاتفریقِ جہت وسمت ''صالح ترین معاشرہ'' کی اکائیاں تھے، جن کے دم سے یہ دنیا رشکِ جناں بن گئی تھی اور انسانی اقدار وکردار اپنے عروج پر پہونچ گئے تھے۔

گرچہ یہ موضوع بہت طویل ہے کہ نبی کریمؐ نے ایک پوری قوم کو کس طرح کرشماتی وحیرت انگیز طریقہ پر ایسی تربیت دی کہ

زمانہ کے سرد وگرم دونوں حالات کو برتنے کا سلیقہ ان میں آ گیا؛

جہاں کردیا نرم نرما گئے وہ
جہاں کردیا گرم گرما گئے وہ

تاہم اختصار کے ساتھ آپؐ کے تربیتی طریقِ کار کے بعض بنیادی اصولوں پر اک سرسری نگاہ ضرور ڈالی جاسکتی ہے۔

رِفق یعنی نرم خوئی وسہل کاری:

آپؐ اس صفت کے مداح تھے، اس کے خوگر تھے اور اس کی ترغیب دیتے تھے، آپؐ کا ارشاد ہے: ''ان الرفق لایکون فی شیء الا زانه و لا یفقد فی شیء الا شانه ''(مسلم) کہ نرم خوئی جس چیز میں بھی پائی جائے اس کو خوبصورت بنادیتی ہے، اور جس چیز میں نہ پائی جائے اس کو عیب دار بنادیتی ہے۔ ایک بار آپؐ نے ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا: ''یا عائشة! ارفقی، فان الله اذا اراد باهل بیت خیرا دلهم علی باب الرفق ''(مسند احمد) کہ عائشہ! نرم خوئی اختیار کرو، کیونکہ اللہ تعالی جب کسی گھرانہ کے ساتھ خیر کا ارادہ فرماتا ہے تو ان کو نرم خوئی کے راستہ پر ڈال دیتا ہے۔

رحم وشفقت:

آپؐ کی خاص وصف قرآن پاک میں 'رحمۃ للعالمین' ہے، آپؐ نے عام انسانوں کے ساتھ ''من لایرحم لایُرحم ''(ابن حبان) کہ جو دوسروں پر رحم نہیں کھاتا دوسرے اس پر رحم نہیں کھاتے کا زریں اصول اپنایا اور بچوں اور نوعمروں کے سلسلہ میں ''لیس منا من لم یرحم صغیرنا ''(مسند احمد) کہ وہ ہم میں سے نہیں جو ہمارے چھوٹوں پر شفقت نہ کرے' کی تدبیر ان کی تربیت کے سلسلہ میں اختیار کی اور اس کی ترغیب دی۔

غصہ پر قابو رکھنا:

آپؐ کی شخصیت کو محبوب ومقبول بنانے میں جن اوصاف کا اہم کردار رہا ہے' ان میں سے ایک یہ ہے کہ آپ اپنے غصہ پر قابو پانے میں غیر معمولی طریقہ پر قادر تھے اور دوسروں کو بھی اس کی ترغیب دیتے تھے، کیونکہ زیادہ تر زیادتی غصہ اور جھنجھلاہٹ ہی کی وجہ سے ہوتی ہے اور بچے خاص طور پر اس کا شکار ہوجاتے ہیں اور اس کی وجہ سے ان کی تربیت کے بڑے قیمتی مواقع ضائع ہوجاتے ہیں۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ: ایک شخص نے آپؐ سے عرض کیا: مجھے نصیحت فرمائیے! آپؐ نے فرمایا: غصہ نہ کیا کرو! (صحیح بخاری)۔

پند ونصیحت کے لئے موقع شناسی:

آپؐ مستقل پند ونصیحت نہیں کیا کرتے تھے، اور اس چیز سے گریز کرتے تھے کہ کہیں لوگ مستقل کی نصیحتوں سے تنگ نہ آجائیں۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ہے کہ: آپ ہمیں روزانہ نصیحتیں نہیں کیا کرتے تھے کہ کہیں ہم بور نہ ہوجائیں اور تنگ نہ آجائیں۔ (صحیح بخاری)

عملی نمونہ پیش کرنا:

آپؐ کی بڑی خوبی یہ تھی کہ آپؐ واعظِ باعمل تھے، جو کہتے تھے خود اس پر عمل پیرا تھے، آپؐ کے قول وعمل میں سرِ مو تضاد نہیں تھا؛ کیونکہ آپ اخلاقِ قرآنی کے حامل تھے اور قرآن کہتا ہے: ''یا ایها الذین آمنوا لم تقولون ما لا تفعلون، کبر مقتا عند الله ان تقولوا ما لا تفعلون''(صف:۲-۳) کہ اے ایمان والو! وہ بات کیوں کہتے ہو جو خود کرتے نہیں، یہ اللہ کے نزدیک بڑی ناراضگی کی بات ہے۔

مار پیٹ سے گریز:

نبی کریم علیہ الصلوۃ والتسلیم نے اپنے تربیت یافتگان سے کبھی مار پیٹ کا سلوک نہیں کیا۔ حدیثِ پاک میں ہے: ''ماضرب رسول الله صلی الله علیه وسلم شیئا قط ''(بخاری ومسلم) کہ آپؐ نے کبھی کسی کو نہیں مارا۔

چیخ پکار لعن طعن سے گریز: آپؐ نے کبھی چیخ پکار یا لعن طعن کا رویہ بھی اپنے تربیت یافتگان کے ساتھ اختیار نہیں کیا، حضرت انسؓ سے مروی ہے: ''لم یکن رسول الله صلی الله علیه

وسلم سبابا و لا لعانا و لا صخابا ''(مسند احمد) کہ آپؐ نہ گالم گلوچ کرنے والے تھے، نہ لعن طعن کرنے اور نہ چیخ پکار کرنے والے تھے۔

دروغ گوئی یا غلط بیانی سے پرہیز:

عام طور پر بچوں کے ساتھ وقتی فائدہ اٹھانے کے لئے ان سے جھوٹ بول دیا جاتا ہے، جھوٹ اور دروغ گوئی سے متعلق آپؐ نے متعدد احادیث میں تنبیہ کی ہے۔

مندرجہ بالا امور جہاں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے شخصی اوصاف تھے، وہیں آپؐ کے تربیتی کردار و طریقۂ کار کا حصہ بھی۔ یہ اصول وضوابط جہاں مربی کی اعلی وارفع نفسیات کی طرف اشارہ کرتے ہیں، وہیں اس کے تربیت یافتگان پر بھی بھرپور اثر انداز ہوئے اور ان کے نفس کی تہذیب میں کلیدی رول ادا کیا۔

''بچوں کی تربیت کے رہنما اصول' نفسیاتی اصولوں کی روشنی میں'' جو کہ عالمِ عرب کے معروف ماہرِ نفسیات ڈاکٹر مامون مبیض کی کتاب ''اولادنا من الطفولة الى الشباب '' کا ترجمہ ہے، بہ ظاہر محض جدید علم نفسیات کی روشنی میں تربیت کے اصول بیان کرتی ہے، تاہم غور کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب معجزاتی و لاشعوری طور پر سائنسی نظریات کی ترجمانی کرتے ہوئے بیک وقت اسلامی و نبوی اصول کی بھی بھرپور ترجمانی کرتی ہے۔ اگر چہ اس بات کا امکان ہے کہ جستہ جستہ کتاب سے اقتباسات نقل کر کے اس کو ثابت کیا جائے، لیکن اس امید پر کہ قارئین کے لئے اس امتزاج و یکسانیت کو محسوس کرنا دشوار نہیں ہوگا' بے جا طوالت سے پرہیز کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

اس کتاب میں جس خوبی سے والدین و اولاد کے مابین تربیتی مسائل کو زیرِ بحث لایا گیا ہے وہ قابلِ تعریف ہے، قاری کو ہر مسئلہ اپنے گھر اور اپنی فیملی کا محسوس ہوتا ہے، جو اس بات کی دلیل ہے کہ یہ کتاب واقعیت پر مبنی ہے اور اس میں پیش کردہ حل اور طریقۂ کار یقینی طور پر قابلِ عمل ہے۔ کتاب اپنی ضخامت کے اعتبار سے بھی اور گوناگوں مباحث کی بنا پر بھی ایک موسوعاتی پیش کش ہے' جس سے قاری کو پورے طور پر تشفی حاصل ہوتی ہے۔ اس کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ بہت سے مسائل کو مثالوں کے ذریعہ، نقشوں کے ذریعہ، مکالماتی شکل دے کر اور سچویشن create کر کے سمجھانے کی کوشش کی ہے، جس سے قاری میں دلچسپی پیدا ہوتی ہے اور اس کو مسائل کے باریکی سے سمجھنے میں سہولت ہوتی ہے، اور اس طرح جب عملی تطبیق کا وقت آئے گا تو وہ مفروضہ واقعہ کے اجزاء میں درست طریقہ پر حقیقت کا رنگ بھر سکے گا۔ اور یہ ایک بڑی خصوصیت ہے جو اس کتاب کو موضوع کی دیگر کتابوں سے ممتاز کرتی ہے، اور بجا طور پر کہا جاسکتا ہے کہ بچوں کی پیدائش سے لے کر جوانی تک کے تربیتی مسائل، اور ان کی پرورش کے سلسلہ میں والدین سے لے کر دادا دادی تک کی گھریلو فضا کا واقعیت اور گہرائی کے ساتھ جائزہ لینے اور رہنمائی کرنے میں یہ کتاب اپنی مثال آپ ہے۔

ڈاکٹر طارق ایوبی ندوی علیگ صاحب اردو اور عربی دونوں زبانوں پر یکساں قدرت رکھتے ہیں، دونوں زبانوں میں ان کی تصنیفات اس کا شاہدِ عدل ہیں۔ وہ پوری اردو برادری کی جانب سے مبارکباد و تشکر و امتنان کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اس وقیع کتاب کے زریں اصولوں کو پوری چابکدستی اور فنی مہارت کے ساتھ اردو قالب میں ڈھال کر اس کی افادیت کے دائرہ کو وسعت بخشی دی ہے۔ کتاب دیکھ کر اور پڑھ کر یہی محسوس ہوتا ہے کہ یہی اصل ہے، کسی کی ترجمانی نہیں ہے۔ گرچہ اس فن پر عربی زبان میں درجنوں کتابیں ہیں، لیکن ڈاکٹر مامون مبیض کی اس کتاب کا انتخاب 'حسنِ انتخاب' کا مصداق ہے۔ اللہ تعالی سے دعا ہے کہ اس کو مقبولِ خاص و عام بنائے اور دینی و دنیوی دونوں حیثیتوں سے اہمیت دینے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

❑ گوشۂ ادب

شاہین باغ کی معزز خواتین کے نام

ڈاکٹر احمد مجتبیٰ صدیقی
شعبۂ جغرافیہ
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

دخترانِ ملت اسلامیہ تم کو سلام
با وفا فرزندگان جامعہ تم کو سلام

چھوڑ کر گھر بار سارا راہِ حق میں آ گئیں
دیکھتے ہی دیکھتے ہندوستاں پہ چھا گئیں

عزم و استقلال کے روشن ہوئے ہیں تم سے باب
ایک بستی کو بنایا تم نے شہر انقلاب

خیمہ زن تم ہو گئیں بزم طرب کو چھوڑ کر
واپسی کرنا ہے باطل کا تکبر توڑ کر

قوم کی پردہ نشیں ماؤں کی ہمت دیکھ کر
بھائی بھی پر عزم ہیں بہنوں کی طاقت دیکھ کر

ولولہ انگیزیوں سے پر تمہاری داستاں
یاد رکھے گا زمانہ دختر ہندوستاں

سرد راتوں میں تمہاری نیند کی قربانیاں
رنگ لائیں گی یقیناً صبر کی رعنائیاں

ملت اسلامیہ کو سرخرو تم نے کیا
خود کو اعلیٰ حوصلوں کے روبرو تم نے کیا

جگمگائے اس زمیں پہ تم نے سجدوں کے نشاں
روزِ محشر یہ بنیں گے مغفرت کے سائباں

ملک و ملت کو بچانے کا کیا عزم جواں
اب تمہاری داستاں لکھے گا ہر تاریخ داں

سب کے سب حیران ہیں ان آندھیوں کو دیکھ کر
احتجاجی دادیوں اور نانیوں کو دیکھ کر

ہاتھ میں ان کے ترنگا اور ہتھیلی پر ہے جاں
اک جنوں میں ڈوب کر نکلا ہے ہر طفل و جواں

ہے کوئی تفریق مذہب کی نہ کوئی امتیاز
ایک نغمہ ایک سُر ہے ایک لَے ہے ایک ساز

ہے مسلمانوں کے ہاتھوں میں یہاں ہندو کا ہاتھ
ایک ہی صف میں کھڑے ہیں سارے بھائی ساتھ ساتھ

مرحبا صد مرحبا صد مرحبا شاہین باغ
ہر گلی کوچہ ہوا شیدا ترا شاہین باغ

یہ ترے اخلاص کا ثمرہ ہوا شاہین باغ
سارے ہی مذہب ہوئے یکجا یہاں شاہین باغ

ہے دعا احمدؔ کی تابندہ رہے تیرا وقار
فتح و نصرت اب عطا کردے تجھے پروردگار

☆☆☆